www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

January 2005 • No. 338

اسپین کا سفر

اسپین کے شہر اشبیلیہ (Seville) میں ورلڈ ریلیجس لیڈرس کی کانفرنس تھی۔ یہ کانفرنس ۱۴ دسمبر سے ۱۸ دسمبر ۲۰۰۳ تک جاری رہی۔ اس انٹرنیشنل کانفرنس کا اہتمام تین اداروں کی طرف سے کیا گیا تھا۔ حکومت اندلس، یونیسکو اور ایلیجا اسکول (Elijah School)۔

اس کی دعوت پر اسپین کا سفر ہوا۔ ۱۱ دسمبر کی رات کو دہلی سے روانگی ہوئی اور ۱۹ دسمبر ۲۰۰۳ کو سفر سے واپسی ہوئی۔ اس سفر کی مختصر روداد یہاں درج کی جاتی ہے۔

نظام الدین سے نکل کر ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوا تو سڑک کے دائیں طرف مغل حکمراں ہمایوں کا مقبرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اور آگے بڑھا تو سڑک کے بائیں طرف صفدر جنگ کا مقبرہ تھا اور دائیں طرف ابراہیم لودھی کا مقبرہ۔ اس سے کچھ فاصلہ پر دہلی کا مشہور لال قلعہ کھڑا ہوا تھا جس کے بارے میں ۱۹۴۷ میں ایک شاعر نے اپنی نظم میں یہ شعر شامل کیا تھا:

اے قلعۂ سرخ اے اثر شاہجہانی　　بربادشدہ عظمت ماضی کی نشانی

اس طرح کی یادوں کے ہجوم میں میری گاڑی آگے بڑھ رہی تھی اور دہلی کا قدیم زمانہ یاد آرہا تھا جب کہ یہاں مسلمانوں کا سیاسی غلبہ قائم تھا۔ یہ غلبہ عملاً بہت پہلے ختم ہونا شروع ہوگیا تھا تاہم ۱۸۵۷ میں وہ آخری طور پر ختم ہوگیا۔ اس کے بعد ایک اردو شاعر نے ایک لمبی نظم لکھی جس کا ایک شعر یہ تھا:

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ　　نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

تاریخ کا یہ تصور مجھے نہایت محدود نظر آتا ہے کہ صرف حکمرانوں کے حوالے سے تاریخ کو پڑھا اور سمجھا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کسی حکمراں یا حکمراں خاندان سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ موجودہ زمانہ میں ان غیر سیاسی پہلوؤں کی وسعت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ابن خلدون (وفات ۱۴۰۶ء) نے اپنے مقدمہ میں اس پہلو کی طرف نہایت وضاحت کے ساتھ نشاندہی کی تھی۔

مگر مسلم علماء اور دانشوروں میں یہ تاریخی تصور کبھی رائج نہ ہوسکا۔ اسی طرز فکر کا نتیجہ ہے کہ موجودہ مسلمان یہ دریافت نہ کر سکے کہ آج وہ قدیم مسلم حکومت کے دور کے مقابلہ میں ہر اعتبار سے زیادہ بہتر حالت میں ہیں۔ حتیٰ کہ سیاست کے اعتبار سے بھی۔

ایر پورٹ پہنچا تو مسافروں کی بھیڑ دکھائی دی۔ اس کو دیکھ کر بظاہر کوئی شخص یہ رائے قائم کرے گا کہ انڈیا میں ہوائی جہاز کا سفر بہت بڑھ گیا ہے۔ حالاں کہ اسی ایر پورٹ پر اگر کوئی شخص دن کے وقت آئے تو اس کو یہاں سناٹا دکھائی دے گا۔ جب کہ مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہاں دن کے اوقات میں مسافروں کی بھیڑ ہوتی ہے اور رات کے وقت سناٹے کا عالم ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مغربی ملکوں کے لوگ ہوائی جہازوں کے شور سے اپنی نیند کو خراب کرنا گوارا نہیں کرتے۔ اس لیے انہوں نے اپنے ائرپورٹ پر نائٹ کرفیو (night curfew) لگا رکھا ہے۔ انڈیا جیسے غیر ترقی یافتہ ملک اس کی قیمت اس طرح ادا کرتے ہیں کہ ان کے یہاں بین اقوامی پروازیں زیادہ تر رات کو اترتی ہیں اور روانہ ہوتی ہیں۔

ائرپورٹ کے اندر ایک جگہ کاؤنٹر پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

اسپیشل ہینڈلنگ (special handling)

یہ ونڈو ان لوگوں کے لیے تھی جو اپنی کسی معذوری کی بنا پر وہیل چیئر پر بٹھا کر جہاز تک لے جائے جاتے ہیں۔ گویا معذور لوگوں کے لیے خصوصی مدد کا انتظام ہے۔ اس دنیا میں معذوری بھی ایک پلس پوائنٹ کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ سفر ٹرکش ائرلائنز کی فلائٹ نمبر TK 1071 کے ذریعہ ہوا۔ دلی سے اس کا مقرر وقت ساڑھے ۴ بجے تھا۔ آدھا گھنٹہ لیٹ ہوکر جہاز ۵ بجے صبح دہلی سے روانہ ہوا۔ دہلی سے استانبول کا سفر بغیر رکے ہوئے سات گھنٹہ کا تھا۔ راستہ میں نیند آتی رہی اور سفر آسانی کے ساتھ طے ہوگیا۔ پوری پرواز ہموار (smooth) تھی۔

راستہ میں ۱۲ دسمبر ۲۰۰۳ کے بعض اخبارات دیکھے۔ ایک اخبار میں ایک آرٹیکل کے تحت

مشہور کوہ پیما سر ایڈمنڈ ہیلری کا تذکرہ تھا۔ وہ کئی بار ناکام ہونے کے بعد مئی ۱۹۵۳ میں ہمالیہ کی چوٹی پر پہنچا تھا۔ ایک ناکامی کے بعد اس نے اپنی مٹھی بلند کی اور پہاڑ سے کہا: ''تم نے مجھے ہرایا ہے مگر میں دوبارہ آؤں گا اور تم کو ہراؤں گا۔ کیوں کہ تم اور زیادہ بڑے نہیں ہو سکتے مگر میں ہو سکتا ہوں'':

You have defeated me but I will return and I will defeat you because you can not get any bigger but I can.

دہلی سے سات گھنٹہ کی پرواز کے بعد جہاز استانبول کے ہوائی اڈہ پر اترا۔ یہ ہوائی اڈہ کافی اچھا بنا ہوا تھا۔ وہ ایک یورپی ہوائی اڈہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ دہلی کے انٹرنیشنل ائرپورٹ اور استانبول کے ائرپورٹ میں کوئی مقابلہ نہیں۔

استانبول کے شاندار ایرپورٹ پر میں نے دیکھا کہ وہاں کے طویل رن وے پر ایک کے بعد ایک جہازوں کی لائن لگی ہوئی ہے۔ یہاں ہر وقت یا تو کوئی جہاز اترتا ہے یا کوئی جہاز اڑ کر فضا میں داخل ہوتا ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ مسلمان سو سال سے ترکی کی عثمانی خلافت کے خاتمہ پر سوگ منا رہے ہیں۔ شبلی نعمانی (وفات ۱۹۱۴) کا یہ شعر اس معاملہ میں مسلم نفسیات کی ترجمانی کرتا ہے:

زوال دولت عثماں زوال شرع وملّت ہے　　عزیزو فکر فرزند وعیال وخانماں کب تک

جب کہ حال یہ ہے کہ آج کا ترکی پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی کر چکا ہے۔

پرنٹنگ پریس کا زمانہ ایک عظیم خدائی نعمت کا ظہور تھا۔ مگر اخبار اور کتاب دونوں کے ذریعہ پریس کا جو استعمال ہوا وہ ایسا تھا کہ اس نے مسلمانوں کو کھوئی ہوئی عظمت سے تو مبالغہ آمیز طور پر باخبر کیا مگر ملی ہوئی عظمت سے ان کو بالکل بے خبر رکھا۔ چنانچہ مسلمان عظمت ماضی کے تصور میں اتنا زیادہ گم رہے کہ وہ حال کی عظمت سے بالکل بے خبر ہو گئے۔

استانبول کا قدیم نام قسطنطنیہ (Constantinople) تھا۔ یہ ترکی کا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہ شہر پہلے بازنطینی ایمپائر کی راجدھانی تھا۔ اس کے بعد وہ عثمانی خلافت کی راجدھانی بنا۔ قدیم شہر کی

دیوار ابھی تک یہاں موجود ہے۔ استانبول کی تاریخ ۲۵۰۰ سال پیچھے تک پھیلی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یونانیوں نے ۶۵۷ قبل مسیح میں استانبول کی بنیاد رکھی۔ موجودہ استانبول دو حصوں میں بٹا ہوا ہے— قدیم شہر اور جدید شہر۔ قدیم شہر میں تنگ گلیاں ہیں اور وہی ماحول ہے جو دہلی کے پرانے علاقہ میں دکھائی دیتا ہے۔ البتہ جدید استانبول ماڈرن یوروپ کے انداز میں بنایا گیا ہے۔

استانبول میں ایک مشہور اسلامک رائٹر رہتے ہیں۔ ان کا نام مسٹر ہارون یحییٰ ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ انہوں نے اسلام پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ یہ کتابیں انہوں نے ترکی زبان میں لکھی تھیں۔ پھر ان کا ترجمہ انگریزی زبان میں ہوا۔ ان کا ایک بڑا ادارہ استانبول میں ہے۔

ہارون یحییٰ کے ادارہ کی ایک ذمہ دار خاتون سسٹر بانو ڈیرن (Sister Banu Derin) کی طرف سے مجھے دہلی میں ٹیلی فون پر یہ پیغام ملا تھا کہ میں استانبول میں کچھ وقت کے لیے ٹھہروں اور ان کے ادارہ کو دیکھوں۔ مجھے خود اس کا شوق تھا۔ مگر پہلے سے اس کے مطابق پروگرام نہ بن سکا۔ چنانچہ میں استانبول میں نہ ٹھہر سکا اور معمول کے مطابق، استانبول ایر پورٹ سے دوسرے جہاز کے ذریعہ آگے کے لیے روانہ ہو گیا۔

مز پریا ملک نے ہارون یحییٰ کی اکثر کتابیں پڑھی ہیں۔ میں نے ان سے ہارون یحییٰ کی کتابوں کے بارے میں ان کا تاثر پوچھا تو انہوں نے اپنا تاثر ان الفاظ میں بیان کیا:

> Harun Yahya tries to increase faith through scientific reasoning. But the only problem is that he becomes too technical in his scientific description which at times makes it difficult to comprehend. (Priya Malik)

استانبول سے ہمیں میڈرڈ کے لیے اگلا جہاز لینا تھا۔ وقت بہت کم تھا۔ مگر ہوائی اڈہ کے عملہ نے ساری کارروائی اتنی تیزی سے انجام دی کہ ہم وقت پر ہوائی جہاز کے اندر پہنچ گئے۔

استانبول سے میڈرڈ کی پرواز ساڑھے تین گھنٹہ کی تھی۔ راستہ میں ٹرکش ایرلائن کی فلائٹ میگزین اسکائی لائف (Skylife) کا شمارہ دسمبر ۲۰۰۳ دیکھا۔ اس کے مضامین ٹرکش اور انگریزی

دونوں زبانوں میں تھے۔اس کا ایک مضمون بداپسٹ (Budapest) کے بارے میں تھا۔

جیسا کہ معلوم ہے، بداپسٹ ایک زمانہ میں ترکوں کی عثمانی سلطنت کے تحت تھا۔ چنانچہ مضمون میں بتایا گیا تھا کہ اب بھی عثمانیوں کے آثار شہر میں ترکی طرز کے غسل خانوں کی صورت میں موجود ہیں جو کہ پورے شہر میں پھیلے ہوئے ہیں ۔ دریائے دانوب (Danube) کے کنارے اب بھی گل بابا کا مزار موجود ہے جس کو یحییٰ پاشا نے سولہویں صدی میں اس گلاب پسند درویش کی یادگار میں بنایا تھا:

Even the Ottomans have a place in it with their baths scattered throughout the city and the Gulbaba Tomb built by Yahya Pasazade Mehmet Pasha in the 16th century to commemorate the rose loving Bektashahi dervish. p. 29

میڈرڈ اسپین کی راجدھانی ہے۔ ۱۲ دسمبر کی صبح کو میں یہاں کے ائر پورٹ پر پہنچ چکا تھا۔ میڈرڈ ائر پورٹ نہایت وسیع اور شاندار ہے۔ یہاں مسافروں کی سہولت کے لیے ہر قسم کا اعلیٰ انتظام تھا۔ جب میں میڈرڈ کے شاندار ائر پورٹ پر چل رہا تھا تو بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے روتے ہوئے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں سب سے زیادہ جو چیز کھوئی گئی وہ اعتراف اور انسانیت کی خیر خواہی ہے۔ اگر ان کے اندر یہ صفت موجود ہوتی تو وہ اس واقعہ پر تڑپ اٹھتے۔ وہ یہاں آ کر ان لوگوں سے کہتے کہ ہم آپ کے کارناموں کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہم نے انسانی قافلہ کو روایتی ترقی کے دور تک پہنچایا تھا، آپ نے اپنی محنت سے انسانیت کو سائنسی ترقی کے دور تک پہنچا دیا اور تاریخ میں پہلی بار ایک خوبصورت دنیا تعمیر کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ آیئے ہم دونوں مل کر خالق کا شکریہ ادا کریں۔ تاکہ ہم دونوں خدا کی زیادہ بہتر دنیا میں داخلہ کے مستحق قرار پائیں۔ وہ معیاری دنیا جس کی صرف ایک جھلک خدا نے آج کی دنیا میں رکھی ہے تاکہ ہم بعد کی زیادہ بہتر دنیا کا پیشگی تعارف حاصل کر سکیں، یعنی وہ دنیا جس کا نام جنت ہے۔

ایک مسلم شاعر نے کہا ہے کہ — ہر ملک ہمارا ہے، کیوں کہ وہ ہمارے خدا کی ملکیت ہے:

ہر ملک مُلکِ ما است کہ مِلکِ خدائے ما است

اس شعر میں مجھے سیاسی توسیع کی بو آتی ہے۔ اس لیے وہ مجھے پسند نہیں۔ اس کے مقابلہ میں میرا ذوق یہ ہے کہ میں ہر ترقی کو اپنی ترقی سمجھتا ہوں، کیوں کہ وہ انسان کی ترقی ہے جس کا میں بھی ایک حصہ ہوں۔ اسی انسانی ذہن کو میں داعیانہ ذہن سمجھتا ہوں۔ داعی تمام انسانوں کو ایک فیملی کے روپ میں دیکھتا ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: **الخلق عیال اللہ**۔ اس سے عمومی خیر خواہی کا وہ ذہن بنتا ہے جس کو قرآن میں نُصح کہا گیا ہے۔ دعوت کا عمل دوسرے انسانوں کے ساتھ خیر خواہی کا عمل ہے، نہ کہ دوسرے انسانوں کے اوپر اپنی برتری قائم کرنے کا عمل۔

میڈرڈ ملک کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ وہ اسپین کی راجدھانی ہے۔ ۱۰۸۳ تک میڈرڈ میں مسلمانوں کی سلطنت تھی۔ اس سال الفانسو ششم (Alfanso VI) نے اس کو مسلمانوں سے چھین کر اپنی سلطنت میں داخل کیا۔ ۱۳۲۹ میں یہاں پارلیمنٹ قائم ہوئی اور اس کو باقاعدہ طور پر اسپین کی راجدھانی کی حیثیت ملی۔ ۱۵۶۱ میں فلپ دوم نے یہاں اپنا قلعہ بنایا۔ میڈرڈ کے بارے میں ایک سیاح نے لکھا ہے کہ میڈرڈ ایک ایسا شہر ہے جہاں رنگ کے مقابلہ میں روشنی اور خوبصورتی کے مقابلہ میں مہربانی زیادہ اہمیت رکھتی ہے:

Madrid is a city in which light is more important than colour, grace more than beauty.

کہا جاتا ہے کہ میڈرڈ کے لوگ ایک قسم کے رومانی خیالات میں جیتے ہیں۔ اس کے بارہ میں ایک فرانسیسی مشاہد نے لکھا ہے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ میڈرڈ عظمتوں اور مسرتوں کا مرکز ہے:

They believe Madrid to be the very centre of all glory and happiness.

مذکورہ فرانسیسی مشاہد نے مزید لکھا ہے کہ میڈرڈ والوں کے نزدیک جنت کا راستہ میڈرڈ سے جاتا ہے اور جنت میں ایک کھڑکی ہے جس سے میڈرڈ کو دیکھا جا سکے:

.....From Madrid to Heaven, and in Heaven a little window from which to look at Madrid.

میڈرڈ میں اب بھی وہ محل موجود ہے جس کو مسلم عہد میں بنایا گیا تھا۔ اس کا نام القصر تھا، اس کو اب الکیزر (Alcazar) کہا جاتا ہے جو القصر کے لفظ کی اسپینی صورت ہے۔ فلپ سوم (Philip III) نے میڈرڈ کو اپنی راجدھانی بنایا۔

میڈرڈ ملک کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ وہ ۱۶۰۷ء میں راجدھانی بنایا گیا۔ اس وقت وہاں بادشاہ کی حکومت تھی۔ کسی ملک کی راجدھانی عام طور پر کسی بڑے دریا کے کنارے ہوتی ہے یا کسی تجارتی صحرا پر۔ مگر اسپین کے جائے وقوع کے بارے میں اس قسم کا کوئی سبب موجود نہیں۔

میڈرڈ ایرپورٹ پر ہر کاؤنٹر کے آگے ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مستعدی ہمارا مقصد ہے جس کا فائدہ آپ کو بھی ملے گا اور ہم کو بھی:

Punctuality is our aim. You will benefit so will we all.

وقت کی پابندی (punctuality) کی اہمیت زندگی میں بہت زیادہ ہے۔ انسان کو جو وقت ملا ہے وہ بہت محدود ہے۔ وقت کی پابندی کا مطلب دراصل وقت کا صحیح اور بھرپور استعمال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وقت کسی انسان کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔ جو انسان اپنے اس خزانہ کو درست طور پر استعمال کرنا جان لے، اس کی کامیابی کے لیے صرف یہی خزانہ کافی ہو جائے گا۔ یہ خزانہ اس کی ہر دوسری کمی کی تلافی بن جائے گا۔

دہلی سے استانبول تک کا سفر ٹرکش ائرلائنز کے ذریعہ ہوا تھا۔ میڈرڈ سے اشبیلیہ کا سفر آئبیرین ایرلائنس کے ذریعہ طے ہوا۔ آئبیرین ایرلائنس کا ٹکٹ ہمارے پاس انٹرنیٹ کے ذریعہ بھیجا گیا تھا۔ اس کو الکٹرانک ٹکٹ کہتے ہیں۔ وہ ایک سادہ کاغذ پر ایک ٹائپ شدہ خط جیسا ہوتا ہے۔ اس طریقہ نے سفر میں بہت سہولت پیدا کر دی ہے۔ الکٹرانک ٹکٹ کا طریقہ تقریباً چھ ماہ پہلے شروع ہوا اور تیزی سے مقبول ہوتا جا رہا ہے۔

میڈرڈ سے اشبیلیہ (Seville) کا سفر اس علاقہ کے اوپر سے ہوا جو کبھی مسلم سلطنت کا حصہ تھا۔ جب ہمارا جہاز اس علاقہ کے اوپر سے گزر رہا تھا تو میں نے سوچا کہ مسلمان جب اس علاقہ میں

آئے تو وہ گھوڑوں پر سوار ہوکر آئے تھے۔ آج میں اسی علاقہ کے اوپر ہوائی جہاز کے ذریعہ سفر کر رہا ہوں۔ میرا ذہن سوچنے لگا کہ قدیم اور جدید کے اس فرق میں کیا سبق ہے۔ کیا وجہ ہے کہ مسلمان گھوڑے کی سواری کے دور میں دنیا میں غالب حیثیت رکھتے تھے اور ہوائی جہاز کی سواری کے دور میں وہ مغلوب ہوکر رہ گئے۔

پھر میں نے سوچا کہ یہ طرز فکر درست نہیں۔ تاریخ کا سفر خود اپنے قوانین کے تحت ہوتا ہے۔ اس کو مسلم اور غیر مسلم کے خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ اس کو انسانیت کی تاریخ کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ مسلم اور غیر مسلم کے خانوں میں بانٹ کر تاریخ کو دیکھا جائے تو اس سے متعصّبانہ ذہن بنتا ہے۔ لیکن جب تاریخ کو انسانیت عامہ کے حوالہ سے دیکھا جائے تو اس سے ایجابی ذہن پیدا ہوگا۔ اور یہی فرق یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ تاریخ کی ترقیوں کو انسانی قافلہ کے سفر کے طور پر دیکھنا ہی مطالعہ تاریخ کا صحیح طریقہ ہے۔

اشبیلیہ کے ائرپورٹ پر مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے جب ہم آخری چکنگ کاؤنٹر پر پہنچے تو یہاں کچھ آدمی کھڑے تھے جو ہر مسافر کے بیگ کو کھول کر دیکھ رہے تھے۔ میرے ساتھی نے میرا بیگ ٹیبل پر رکھا تو ائرپورٹ کے آدمی نے پوچھا کہ آپ کہاں سے آرہے ہیں۔ میں نے کہا کہ انڈیا سے۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے کہا کہ بہت خوب۔ میں بھی انڈیا جانا چاہتا ہوں۔

Great, I want to go to India.

یہ کہہ کر اس نے میرا بیگ مزید تفتیش کے بغیر میرے حوالہ کر دیا۔ انڈیا کی تصویر پہلے دنیا کی نظر میں یہ تھی کہ وہ ہاتھیوں اور سانپوں کا ملک ہے۔ یہاں جادوگر اور سپیرے رہتے ہیں۔ مگر پچھلے کچھ سالوں کے درمیان انڈیا کی امیج مکمل طور پر بدل گئی ہے۔ ہر ملک، بشمول مسلم ملک میں انڈیا کے لوگوں کی قدردانی بہت بڑھ گئی ہے۔ اس میں خاص طور پر دو باتوں کا دخل ہے۔ ایک یہ کہ امریکا اور برطانیہ کے بعد انڈیا انگریزی دانی میں نمبر تین ملک سمجھا جاتا ہے۔ اس بنا پر یہاں جدید ترین شعبہ (انفارمیشن ٹکنالوجی) میں بہت زیادہ ترقی ہوئی ہے۔ دوسری بات وہ ہے جو سفر سے صرف ایک دن پہلے مجھے امریکا میں مقیم ایک

تعلیم یافتہ مسلمان نے بتائی۔ وہ دہلی سے تعلق رکھتے ہیں اور آج کل وہ نیوجرسی (امریکا) میں کمپیوٹر انجینئر کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ امریکا میں چھ ملین سے زیادہ مسلمان ہیں اور تقریباً اتنی ہی تعداد میں ہندو بھی وہاں رہتے ہیں۔ مگر یہاں کے ہندو ہر اعتبار سے مسلمانوں سے آگے ہیں۔ وہ نہ صرف زیادہ دولت مند ہیں بلکہ ان کو یہاں زیادہ باعزت درجہ ملا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس کا سبب کوئی تعصب یا یہودی پروپیگنڈہ نہیں ہے بلکہ اس کا سبب صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ہندو اپنے تمام کام پروفیشنل (professional) انداز میں کرتے ہیں۔ جب کہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ابھی تک ان کے یہاں پروفیشنلزم کا تصور بھی نہ آسکا۔ انہوں نے کہا کہ امریکا میں پروفیشنلزم بہت زیادہ ہے۔ وہ یہاں کا کلچر ہے۔ اس لیے فطری طور پر ایسا ہوا کہ ہندو لوگ امریکیوں کو اپنے ورک کلچر کے مطابق نظر آنے لگے۔ جب کہ مسلمانوں کے بارے میں ان کا عام خیال یہ ہوگیا کہ وہ کسی کام کو پروفیشنل انداز میں کرنا نہیں جانتے۔ ڈکشنری کے مطابق پروفیشنلزم یہ ہے:

Professionalism: doing a job in an organized way, with great skill and competence, meeting with the required standard.

۱۲ دسمبر ۲۰۰۳ کی شام کو اشبیلیہ ائرپورٹ سے شہر کی طرف روانگی ہوئی۔ سڑک کافی چوڑی اور ہموار تھی۔ سڑک کے دونوں طرف جدید طرز کے کھلے ہوئے مکان اور دکانیں نظر آئیں۔ پورا راستہ شاداب اور پررونق تھا۔ یہ وہی شہر ہے جو مسلم دور میں اشبیلیہ کے نام سے مشہور تھا۔

میں نے سوچا کہ اگر قدیم اشبیلیہ اور جدید اشبیلیہ کو سامنے رکھ کر تقابل کیا جائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ پہلے یہ ایک ٹاؤن تھا اور اب وہ ایک ماڈرن شہر ہے۔ مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب اسپین کا حوالہ آتا ہے تو وہ صرف ''آسماں نے دولت غرناطہ جب برباد کی'' جیسی زبان بولنا جانتے ہیں۔

میں نے سوچا کہ ایسا کیوں ہے۔ جب کہ اسپین مسلم عہد کے مقابلہ میں آج زیادہ ترقی یافتہ

ملک بن چکا ہے تو اس قسم کی منفی باتیں کیوں۔ میری سمجھ میں آیا کہ موجودہ مسلمان اپنے مزاجی بگاڑ کی بنا پر خود اپنی عظمت پر فخر کرنا تو جانتے ہیں مگر وسیع تر معنٰی میں انسانی ترقی سے وہ اپنے آپ کو وابستہ نہ کر سکے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج کا ایک مسلمان مغل دور اور عثمانی دور اور اندلسی دور سے سوگنا زیادہ بہتر حالت میں رہتا ہے۔ مگر اپنے اس بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر وہ شکایت اور مایوسی کے سوا کوئی اور زبان بولنا نہیں جانتا۔ ورنہ اس کی زبان مثبت باتوں سے سرشار رہتی۔ وہ سمجھتا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم پہلے سے بھی زیادہ خدا کے شکر میں جینے والے بن جائیں۔

ہمارے ہوٹل کے سامنے دور تک سنترے کے درختوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ شہر کے دوسرے حصوں میں بھی کثرت سے سنترے کے ہرے بھرے درخت نظر آئے۔ یہ درخت لال سنترے سے بھرے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے مقامی ساتھی سے پوچھا کہ کیا ان پیڑوں کے سنترے لوگ توڑتے نہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو ایسے ہی کثرت سے اُگتے ہیں (They grow wild)۔ ان کے پھل یہاں نمائشی طور پر باقی رکھے جاتے ہیں۔ یہاں کوئی انہیں توڑتا نہیں، نہ مالک اور نہ کوئی دوسرا شخص۔ میں نے سوچا کہ اگر اس طرح پھلوں سے بھرے ہوئے درخت انڈیا میں کھلے راستوں پر ہوں تو شاید وہاں ایک پھل بھی درخت پر نہ بچے۔

اشبیلیہ میں آنے جانے کے دوران بعض چیزیں ایسی دیکھیں جو غالباً قدیم عرب کے بقایا کے طور پر یہاں اب بھی موجود ہیں۔ مثلاً دکان کے باہر بازار کا سائن بورڈ۔ بہت سے الفاظ سے پہلے ال کا استعمال مثلاً الکیزر (Al Kazares) وغیرہ۔ یہ غالباً قدیم عرب دور کے اثرات ہیں جو ابھی تک باقی ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے، اسپین میں مسلمانوں کی حکومت تقریباً ۸ سو سال تک قائم رہی۔ اشبیلیہ بھی اس کا ایک حصہ تھا۔ مسلمانوں نے یہاں کی چیزوں پر زبان سے لے کر طرز تعمیر تک زبردست اثرات ڈالے۔ اس کے اثرات اب بھی یہاں دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے اشبیلیہ میں جس ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا اس کا طرز تعمیر بھی قدیم عرب طرز سے ملتا جلتا تھا۔

اشبیلیہ (Seville) اسپین کا مشہور شہر ہے۔ قدیم زمانہ میں وہ مسلم اسپین کا کیپٹل تھا۔ اشبیلیہ

۱۱۷۱ء تک رومیوں کے وی زی گوتھ کا کیپٹل رہا۔ اس کے بعد یہاں مسلمانوں کا سیاسی غلبہ قائم ہوا۔ اس سلسلہ میں انسائکلو پیڈیا برٹانیکا میں اس طرح کے الفاظ ہیں:

Seville was known as Hispalis under the Romans and was a visigothic capital until 711, when it was captured by the Moors. After the Muslims were driven out in 1248, the city rapidly rose to eminence.

یعنی اشبیلیہ رومن ماتحتی کے دور میں ہسپالس کہا جاتا تھا اور وہ ۱۱۷۱ تک وی سی گوتھ کی راجدھانی تھا، جب کہ اس پر مسلمانوں نے قبضہ کیا۔ یہاں تک کہ ۱۲۴۸ میں مسلمان یہاں سے نکال دئے گئے۔ اس کے بعد شہر تیزی سے اہمیت اختیار کر گیا۔

ان الفاظ میں مسلم دور کا ذکر جس طرح تحقیری انداز میں کیا گیا ہے اس سے مسلم عہد کی مثبت تصویر سامنے نہیں آتی۔ تاہم دوسرے مغربی مورخین نے نہایت فیاضی کے ساتھ اسپین کے مسلم عہد کے کارناموں کا اعتراف کیا ہے۔

میں نے حال میں ایک معروف عالم کا ایک مضمون پڑھا۔ اس میں انہوں نے جوش کے ساتھ لکھا تھا کہ ہم کو مسلمانوں کی ماضی کی تاریخ پر فخر ہے۔ اس مضمون میں اس قسم کی باتیں تو پر جوش انداز میں بیان کی گئی تھیں۔ مگر اس میں انسانیت کی حالیہ ترقی کا کوئی حوالہ نہ تھا۔ اس مضمون کو پڑھنے والا صرف یہ سوچ سکتا تھا کہ وہ شاندار ماضی کو کھو کر تباہ شدہ حال میں جی رہا ہے۔ مذکورہ عالم کی زبان سے اس قسم کی غیر علمی بات لمبی مدت سے چھاپ کر پھیلائی جارہی ہے۔ یہاں تک کہ اب یہ حال ہے کہ مسلمانوں کا ذہن عام طور پر نفرت اور مایوسی کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ کوئی مثبت پیغام یا کوئی تعمیری منصوبہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اپنے ماضی کی مفروضہ عظمت میں جینا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ انسان کو بیک وقت دو برائیوں میں مبتلا کر دیتا ہے — انسانیت کے ساتھ خیر خواہی کا خاتمہ، اور مثبت انداز میں سوچنے کے قابل نہ رہنا۔

آج دسمبر ۲۰۰۳ کی ۱۳ تاریخ ہے۔ اس وقت میں اسپین کے شہر اشبیلیہ (Seville) کے

ہوٹل میکرینا (Tryp. Macarena) کے روم نمبر ۳۳۸ میں ہوں۔ یہاں آج رات کو میں نے ایک خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹا بچہ ہے۔ اس کے سر پر ترکی ٹوپی ہے۔ اس خواب کے بعد مجھے وہ دور یاد آیا جو ۱۹۳۰ کے لگ بھگ زمانہ میں اعظم گڑھ (اور دوسرے مقامات) میں پایا جاتا تھا۔ اس وقت مسلم شرفاء جھبّو دار ترکی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ میں بھی اس زمانہ میں ترکی ٹوپی پہنتا تھا۔ اس وقت اگرچہ ترکوں کی عثمانی خلافت ختم ہو چکی تھی مگر ان کے زیر اثر جو مسلم تہذیب بنی تھی وہ اب بھی کسی نہ کسی صورت میں مسلمانوں کے درمیان موجود تھی۔

یہ پہلی عالمی جنگ اور دوسری عالمی جنگ کے درمیان کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں ابھی انڈیا قدیم زرعی دور میں تھا۔ زرعی دور سے مراد وہ زمانہ ہے جب کہ مبنی بر زمین اکانومی (land-based economy) کا غلبہ تھا۔ زرعی دور میں معیشت کی بنیاد تمام تر زمین پر ہوتی تھی۔ زمین کے سوا کوئی اور اقتصادی ذریعہ اس زمانہ میں موجود ہی نہ تھا۔ چنانچہ سامان حیات زیادہ تر زمین داروں کے پاس ہوتا تھا۔ عام لوگ معمولی حیثیت میں زندگی گزارتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ اس زمانہ میں ہمارے گاؤں میں اور آس پاس کے پورے علاقے میں صرف دو فیملی تھی جس کے پاس گھوڑا ہوا کرتا تھا۔ ہماری فیملی اور خلیل خاں صاحب کی فیملی۔ اس زمانہ میں گھوڑا اسی طرح ثروت کا نشان تھا جس طرح آج موٹر کار کو ثروت کا نشان سمجھا جاتا ہے۔

یہ سوچتے ہوئے میرا دھیان اپنے گاؤں کی طرف گیا جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ میں نے غور کیا کہ ۱۹۳۰ اور ۲۰۰۳ کے درمیان ہمارے گاؤں میں کیا فرق ہوا ہے۔ میری سمجھ میں آیا کہ پچھلے زمانہ میں ہمارے گاؤں میں صرف دو خاندان تھے جن کے پاس زیادہ سامان حیات موجود تھا۔ آج گاؤں کے تقریباً ہر خاندان کے پاس ساری سہولتیں موجود ہیں۔ مثلاً سڑک، بجلی، ٹیلی فون، پختہ مکان، کوکنگ گیس، کار، بچوں کے لیے بہتر تعلیم، علاج کا انتظام، سفر کی سہولت وغیرہ۔

ٹوپی کا مذکورہ خواب بظاہر بہت بامعنٰی معلوم ہوتا ہے۔ غالباً اس کی تعبیر یہ ہے کہ پچھلے زمانہ میں عام لوگوں کو صرف ایک رنگین ٹوپی ملی ہوئی تھی جو ان کو ایک قسم کا تہذیبی فخر دیتی تھی۔ اس کے سوا حقیقی

معنوں میں سہولیات زندگی انہیں حاصل نہ تھی۔ جب کہ آج یہ حالت ہے کہ زمانہ کی تبدیلی کے نتیجہ میں دولت اور سہولیات زندگی کا ایک سیلاب آچکا ہے جس میں ہر آدمی کو اپنا حصہ مل رہا ہے۔

اس پر غور کرتے ہوئے مزید میری سمجھ میں آیا کہ مسلم رہنماؤں کے دئے ہوئے ذہن کی بنا پر آج بھی مسلمان ایک سنگین غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ عثمانی خلافت کے دور اور مغل سلطنت کے دور کو عظمت کا دور سمجھتے ہیں اور اس کے ختم ہونے کے بعد وہ سمجھتے ہیں کہ اب ان کے پاس کچھ نہیں رہا۔ اس معاملہ میں مسلم نفسیات کی ترجمانی دہلی کے ایک قدیم عالم نے ان الفاظ میں کی تھی:

''مسلمان کے سر سے عزت کی پگڑی اسی وقت اتر گئی جب کہ دہلی میں مغل سلطنت کا خاتمہ ہوگیا''۔

مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے جو الفاظ لکھ رہے ہیں اور بول رہے ہیں ان کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج بھی وہ لوگ اسی قدیم نفسیات میں جی رہے ہیں۔ حالاں کہ لکھنے اور بولنے والے سمیت تمام مسلمان آج جن سہولیات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، وہ عثمانی دور اور مغل دور میں کسی کو حاصل نہ تھیں، حتیٰ کہ بادشاہوں اور نوابوں اور جاگیرداروں کو بھی نہیں۔

کچھ دن پہلے میرے پاس ایک مسلمان ملاقات کے لیے اپنی نئی کار پر بیٹھ کر آئے۔ ان کے ہاتھ پر ایک شاندار گھڑی بندھی ہوئی تھی اور جیب میں خوبصورت قلم لگا ہوا تھا۔ ان کے چہرے پر لگی ہوئی خوبصورت عینک دیکھی جو ان کے شخصی وقار میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ بیٹھتے ہی مسلمانوں کی زبوں حالی کی داستان سنانے لگے۔ اتنے میں ان کی جیب میں رکھے ہوئے موبائل ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس کو کان پر رکھ کر وہ دور کے کسی صاحب سے بات کرنے لگے۔ جب وہ بات کر چکے تو میں نے ان سے پوچھا کہ جس عثمانی دور اور مغل دور کو آپ لوگ اپنے لیے بڑی چیز سمجھتے ہیں کیا اس زمانہ میں کوئی ایک بھی مسلمان ایسا تھا جس کے پاس موبائل ٹیلی فون ہو یا اس کے پاس موٹر کار ہو یا اس کے پاس ایسی گھڑی ہو جو آپ اس وقت پہنے ہوئے ہیں، یا وہ آپ جیسی عینک پہن سکتا ہو جو آپ کی شخصیت کو دوبالا کر رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کا ایک مسلمان قدیم زمانہ

کے نوابوں اور بادشاہوں سے بھی زیادہ بہتر زندگی گزار رہا ہے۔ ایسی حالت میں آپ لوگوں کو یہ کرنا چاہیے کہ پہلے سے بھی زیادہ آپ لوگ خدا کا شکر ادا کریں، نہ یہ کہ شکایت اور مایوسی کی بات کرکے اپنے سینہ کو ناشکری کا قبرستان بنالیں۔

۱۳ دسمبر کی شام کو میں نے دیکھا کہ ہوٹل کی لابی میں تین صاحبان بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں اپنے ساتھی کے ہمراہ وہاں گیا اور خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تعارف کے دوران معلوم ہوا کہ وہ تینوں مسلمان ہیں۔ ان میں ایک پیرس کے ڈنٹسٹ تھے۔ وہ یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ پھر انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔ دوسرے ٹیونس کے ایک تاجر تھے۔ اور تیسرے اسپین کے ایک نومسلم تھے۔ اسپینی بزرگ نے بتایا کہ ان کے پورے خاندان نے اسلام قبول کرلیا ہے۔ اسپین میں کثرت سے زیتون کے باغات ہیں۔ وہ بھی زیتون کے ایک باغ کے مالک ہیں۔ قبول اسلام کا سبب پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ مغربی سماج میں انسان ایک قسم کی مشینی زندگی گزارتا ہے۔ وہ محبت اور انسانیت کے ماحول سے محروم رہتا ہے۔ اسی کمی کے احساس نے انہیں ایک صوفی ماسٹر تک پہنچایا۔ وہ نقشبندی سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے ہاتھ پر انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔ یہ تینوں صوفی مزاج کے تھے اور تینوں کے ہاتھ میں تسبیح دکھائی دیتی تھی۔ ان کے نام یہ ہیں:

Dr. Richard Abdul Hany Lejoyeuk — Paris

Muhammad Farhat — Tunisia

Omar Margarit — Granada, Spain

میرے ساتھی نے میرے بارے میں بتایا کہ وہ **الاسلام یتحدی** کے مصنف ہیں۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ **الاسلام یتحدی** میں نے پڑھی ہے اور اس کی ایک کاپی میرے پاس گھر پر موجود ہے۔ یہ کتاب ٹیونس کے کالجوں میں باقاعدہ طور پر داخل نصاب ہے۔

الاسلام یتحدی جو میری کتاب مذہب اور جدید چیلنج کا عربی ترجمہ ہے وہ عرب دنیا میں بہت زیادہ پھیلی ہے۔ بیرونی سفروں کے درمیان جب بھی میری ملاقات کسی عرب سے ہوتی ہے تو اکثر

وہ یہی کہتا ہے کہ میں نے آپ کی کتاب **الاسلام یتحدی** پڑھی ہے۔(**لقد قرأت کتابك الاسلام یتحدی**)

ابھی تک مجھے اس کتاب پر تنقید کرنے والا کوئی عرب نہیں ملا۔ صرف ریاض کے ایک صاحب دکتور عبد الرحمٰن الجہنی نے اصل کتاب کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اس کا نام زیادہ صحیح طور پر **الاسلام یُتحدی** ہونا چاہیے۔ میں نے کہا کہ یہ نام میرا رکھا ہوا نہیں ہے بلکہ وہ قاہرہ کے مشہور عالم اور وکیل الازہر شیخ محمد عبد اللطیف دراز (وفات ۱۹۷۶) کا رکھا ہوا ہے۔ پھر میں نے کہا کہ میرے نزدیک یہ نام درست ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جدید فکری چیلنج کے مقابلہ میں اسلام کا کیس اتنا زیادہ طاقتور ہے کہ وہ خود جدید الحادی افکار کو چیلنج دینے کی پوزیشن میں ہے۔ گویا کہ کتاب کے ٹائٹل کا مطلب ہے — اسلام جوابی چیلنج کرتا ہے۔ اس معاملہ میں اسلام اقدام کی پوزیشن میں ہے نہ کہ صرف دفاع کی پوزیشن میں۔

میرے ساتھی نے فرانس کے نومسلم ڈنٹسٹ سے پوچھا کہ آپ یہودیت کو چھوڑ کر اسلام میں کیسے آئے۔ انہوں نے جواب دیا کہ پہلے گویا کہ میں چاند پر تھا اور اب میں زمین پر آ گیا ہوں:

Earlier I was living on the moon, now I am living on earth.

مذکورہ نومسلم کا مطلب یہ تھا کہ پہلے میں اپنی فطرت کی مطلوب دنیا کے لیے گویا خلا میں سرگرداں تھا اب میں نے اپنی فطرت کی آواز کے مطابق یہ مطلوب دنیا پالی ہے۔ ان کو اسلام کی یہ دریافت ایک صوفی بزرگ کے ذریعہ ہوئی۔ وہ مادّی دنیا سے غیر مطمئن تھے۔ مادی ترقیوں میں انہیں اپنی فطرت کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ پھر جب وہ صوفی بزرگ سے ملے تو انہیں روحانیت کی سطح پر اپنی فطرت کا جواب مل گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اب نہایت اطمینان کی حالت میں ہیں۔ ان کو کامل ذہنی سکون مل گیا ہے۔ وہ اپنا زیادہ وقت ذکر اور تسبیح میں گزارتے ہیں۔ تاہم ان کے اندر میں نے عمومی دعوت کا جذبہ زیادہ نہیں پایا۔

موجودہ زمانہ میں مسلم علماء اور دانشوروں کے مطالعہ کا ایک ہی مشترک انداز ہے۔ وہ یہ کہ

مسلمانوں کے تمام مسائل ومصائب کو اہل مغرب کی سازش کا نتیجہ قرار دے کر شکایت اور احتجاج میں مشغول ہوجانا۔ اس کی ایک مثال ایک معروف اسلامی میگزین میں نظر آئی جس میں ایک مشہور مسلم دانشور کا مقالہ چھپا ہوا تھا۔ اس مقالہ میں بتایا گیا تھا کہ مغربی تہذیب کے علم بردار کس طرح مسلم دنیا پر اپنی ساری طاقت کے ساتھ حملہ آور ہیں۔ اس مقالہ کا ایک حصہ یہ تھا:

۱۹۸۹ء میں جب روس نے افغانستان سے اپنی فوجیں واپس بلائیں، تو اسی سال کے اکانومسٹ (لندن) نے ایک خصوصی مضمون شائع کیا اور اس میں پوری تاریخ انسانی کے بیس اہم لمحات بیان کئے اور ان میں آخری لمحہ روس کی پسپائی کے بعد بننے والا نیا سیاسی اور تہذیبی نقشہ تھا۔ اس میں ایک جملہ بڑا اہم تھا۔ اس نے کہا کہ روس کی فوجیں تو واپس چلی گئیں، دیوار برلن بھی ٹوٹ گئی، اشتراکیت بھی پسپا ہوگئی لیکن کیا ہمارے پاس دنیا کو دینے کے لیے کوئی نیا حیات بخش نظریہ ہے جو اس خلا کو پر کرسکے۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ اس خلا کو پر نہیں کرسکتا اور پھر اپنے مخصوص انداز میں یہ بات کہی کہ البتہ مسلمانوں کو یہ زعم ہے کہ ان کے پاس ایک نظریہ ہے جو اس خلا کو پر کرسکتا ہے۔ گویا کہ یہ تنبیہہ (warning) تھی کہ اب کشمکش کا جو نیا آہنگ ہے وہ کیا ہوسکتا ہے۔

اسلامی دانشور مزید لکھتے ہیں—اس کے دس سال کے بعد ایک اور دلچسپ چیز اکانومسٹ میں آئی اور وہ یہ تھی کہ انہوں نے یہ بتایا کہ آج سے ایک ہزار سال بعد روس کا ایک مؤرخ گزرے ہوئے ہزار سال کا جائزہ لیتا ہے۔ دو ہزاریے ختم ہوگئے ہیں۔ تیسرا ہزاریہ شروع ہورہا ہے۔ وہ جائزہ لیتا ہے اور وہ جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ سرد جنگ کے ختم ہونے کے بعد اور روس کی اور اشتراکیت کی پسپائی کے بعد امریکا ایک عالمی کردار لے کر اٹھا لیکن اس کے بعد پھر چین اور مسلم دنیا یہ دو نئی قوتیں ابھریں اور اس طرح ایک نئی خلافت قائم ہوئی۔ اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ایسا ہوگا۔ مقصد یہ تھا کہ ایسا نہ ہونے پائے، ہمیں اس کے لیے پیش بندی کرنی چاہیے۔ یہی وہ خیالات ہیں جنہوں نے مغرب کی ذہنی اور فکری فضا بنائی ہے اور آج ان کے تھنک ٹینکس اور سیاسی قیادت سب اس پس منظر میں کام کرتے ہیں اور حکمت عملی بناتے ہیں۔

ہمیں ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کا واقعہ اسی پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ واقعہ کیسے ہوا۔ کس نے کیا۔ کون کون معاون قوتیں تھیں۔ سارے واویلے کے باوجود ان سوالات کا جواب دینے کی کوئی کوشش نہیں ہوئی ہے اور نہ ہو رہی ہے۔ اس کے برعکس ۱۹۸۹ء سے ۲۰۰۱ء تک نئے تہذیبی تصادم کی جو فضا بنائی گئی تھی اس واقعہ کو بنیاد بنا کر اس نقشہ میں رنگ بھرا جا رہا ہے۔

اکانومسٹ کے مذکورہ اقتباس میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس میں ایک مثبت پہلو موجود تھا۔ یعنی اسلام کا نظریاتی اعتراف۔ مگر اس سے ایک منفی نتیجہ نکال لیا گیا۔ یعنی یہ کہ مغربی قومیں خاص طور پر امریکا کی ساری پلاننگ اسلام کو مٹانے کے لیے ہو رہی ہے اور یہ کہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کو ورلڈ ٹریڈ ٹاور کے ساتھ جو حادثہ ہوا وہ خود امریکا کی سازش کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ اس کو استعمال کر کے اسلام کے خلاف سوچی سمجھی کارروائی شروع کر دی گئی۔ کمیونزم کے بعد اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹانا امریکا کا سوچا سمجھا منصوبہ ہے اور اسی کے تحت اس کی تمام جارحانہ کارروائیاں ہو رہی ہیں۔

یہ تجزیہ سراسر بے بنیاد ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ اجودھیا کی بابری مسجد کو خود مسلمانوں نے ڈھایا تھا تاکہ وہ فرقہ پرست ہندوؤں کے خلاف اپنی دفاعی مہم کو تیز تر کر سکیں۔ بدقسمتی سے آج تک مسلم دنیا کے تمام لکھنے اور بولنے والے اسی قسم کی منفی بولیاں بول رہے ہیں۔ ان بولیوں نے مسلمانوں کو منفی سوچ کا کارخانہ بنا دیا ہے۔ مجھے کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ شاید منفی سوچ کا یہی وہ فتنہ ہے جس کو حدیث میں فتنة دهيماء کہا گیا ہے۔

اکانومسٹ کے مذکورہ اقتباس کا سب سے اہم جزء اس کا یہ جملہ تھا: ''البتہ مسلمانوں کو یہ زعم ہے کہ ان کے پاس ایک نظریہ ہے جو اس خلا کو پر کر سکتا ہے''۔ یہ جملہ بتاتا ہے کہ خود مغربی جریدہ کے اعتراف کے مطابق، جدید دنیا میں اسلام کے حق میں ایک قیمتی امکان موجود ہے۔ یہ دعوت کا امکان ہے۔ آج کی ترقی یافتہ دنیا کے پاس سب کچھ ہے مگر اُس کے پاس وہ چیز نہیں جس کو نظریۂ حیات کہا جاتا ہے۔ جدید مغربی انسان کے پاس سامان حیات تو ہے مگر اُس کے پاس نظریۂ حیات نہیں۔ یہ محرومی ایسے ہی ہے جیسے کسی شخص کا جسم تو موجود ہو مگر اُس کی روح اُس سے نکل گئی ہو۔ یہی حال آج کے مغربی

انسان کا ہے۔ یہ صورت حال ہمیں موقع دیتی ہے کہ ہم جدید انسان کو اسلام کے نظریۂ حیات سے متعارف کریں۔ گویا پیاسے انسان کو خدا کا پیدا کیا ہوا پانی پہنچادیں۔

یہ بات بے حد غور طلب ہے کہ کیوں ایسا ہوا کہ پچھلے دو سو برس کے اندر پیدا ہونے والے ہزاروں علماء اور مفکرین اسلام کی صحیح فہم سے عاجز رہے۔ وہ اسلام کو اس کی صحیح صورت میں پیش نہ کر سکے۔ میرے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ یہ تمام لوگ اسلام اور مسلمان کو الگ الگ کر کے نہ دیکھ سکے۔ وہ دونوں کو ایک سمجھ کر ان کا مطالعہ کرتے رہے۔

مثلاً جب انہوں نے اسلام کو سمجھنا چاہا تو بعد کے زمانہ میں بننے والی مسلم تاریخ کو شامل کر کے اسلام کی تصویر بنائی۔ حالاں کہ یہ دونوں الگ الگ موضوعات تھے۔ اسی طرح جب انہوں نے مسلمانوں کی قومی لڑائیوں کو بیان کیا تو اس کو اسلامی جہاد کا عنوان دیتے رہے۔ اس غلط مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ نہ اسلام کو اس کی اصل صورت میں سمجھ سکے اور نہ مسلمانوں کے معاملات کا صحیح تجزیہ کر سکے۔

۱۴ دسمبر کی صبح کو ہوٹل کے مطعم میں ناشتہ کیا۔ یہاں کھانے کے لیے مختلف چیزیں موجود تھیں۔ دودھ کے ایک برتن کے اوپر مندرجہ ذیل الفاظ لکھے ہوئے تھے:

Leche, Milk

میرے ایک ساتھی اس کو گلاس میں لے کر آئے اور کہا کہ یہ لیچی کا مِلک ہے۔ بظاہر اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ لیچی سے بنا ہوا دودھ ہے۔ یہ بات بڑی عجیب تھی۔ پھر میز پر بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے بتایا کہ یہ لفظ لیچی نہیں ہے بلکہ لِشے ہے۔ اسپینی زبان میں اس کا مطلب دودھ ہوتا ہے۔ دودھ کے اس برتن پر انہوں نے ایک طرف اسپینی زبان میں لِشے لکھ دیا اور دوسری طرف انگریزی زبان میں مِلک۔ یہ دونوں ہم معنٰی الفاظ ہیں۔ اس چھوٹی سی مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلط فہمیاں کس طرح پیدا ہوتی ہیں۔

میں اپنے تجربہ کے مطابق کہہ سکتا ہوں کہ زندگی میں اکثر اختلاف اور ٹکراؤ اور دشمنی کے واقعات صرف غلط فہمی کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید انسان کے دین اور عقل دونوں کا

سب سے بڑا امتحان یہ ہے کہ وہ غلط فہمی کے مواقع پر اپنے آپ کو غلط فہمی کے شکار ہونے سے بچا سکے۔

میرے نزدیک صرف دو قسم کے لوگ غلط فہمی کی مہلک برائی سے بچ سکتے ہیں۔ ایک وہ مومن جو خدا کی پکڑ کا خوف رکھتا ہو اور اس بنا پر وہ معاملات میں بے حد محتاط ہو گیا ہو۔ ایسا آدمی دوسرے کے بارے میں بری رائے قائم کرنے سے اپنے کو بچائے گا تا کہ اس کو آخرت میں خدا کی طرف سے سزا کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ دوسرا انسان وہ ہے جس کے اندر پورے معنوں میں ذہنی بیداری آ چکی ہو۔ جس کا شعور اتنا زیادہ بڑھا ہوا ہو کہ وہ جو کچھ سنے یا دیکھے اس کو وہ فوراً مان نہ لے بلکہ وہ اس کا عقلی تجزیہ کرے۔ وہ واقعہ کی اصل حقیقت تک پہنچ کر اپنی رائے بنائے۔ میرے تجربہ کے مطابق، آج ننانوے فی صد لوگوں کے اندر دونوں میں سے کوئی ایک صفت بھی نہیں پائی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل بیشتر لوگ نہایت آسانی سے غلط فہمی کا شکار بن جاتے ہیں۔

مجھے اپنی ذات کے معاملہ میں بار بار یہی تجربہ ہوا ہے۔ میرے بارے میں لوگوں کے اندر عجیب وغریب قسم کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ ان میں سے کوئی شخص جب مجھ سے دہلی میں ملاقات کرتا ہے تو وہ یہ کہہ کر واپس جاتا ہے کہ ہم تو آپ کے بارے میں اخباروں کو دیکھ کر عجیب قسم کا تصور رکھتے تھے۔ حالاں کہ آپ اسی طرح اسلام کے ایک عالم ہیں جس طرح دوسرا کوئی قابل احترام عالم۔

میرے بارے میں ان غلط فہمیوں کا ذریعہ صرف ایک ہے اور وہ اخبارات ہیں۔ اخبارات کا مزاج یہ ہے کہ جب کوئی شخص نیوز میں آ جائے تو وہ اس کے بارے میں سنسنی خیز قسم کی باتیں چھاپتے رہتے ہیں۔ کیوں کہ ان کو یقین ہوتا ہے کہ ان کے قارئین دلچسپی کے ساتھ انہیں پڑھیں گے۔ اب دین اور عقل دونوں کا تقاضا ہے کہ میرے بارے میں رائے قائم کرنے والے میری اپنی تحریروں کی روشنی میں رائے قائم کریں نہ کہ اخباری رپورٹوں کی روشنی میں۔ کسی کو مزید تحقیق درکار ہو تو اس کو میرے پاس آ کر مجھ سے پوچھنا چاہیے۔ مگر لوگوں کے اندر نہ دینی سنجیدگی ہے اور نہ عقلی بصیرت۔ اس لیے وہ بے بنیاد طور پر غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

کچھ لوگ میرے بارہ میں محض قیاس کی بنا پر ایک عجیب وغریب قسم کی غلط فہمی میں رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ الرسالہ میں سفرنامے اس لیے چھاپے جاتے ہیں کہ الرسالہ کے مرتب کے پاس مضامین کی کمی ہوگئی ہے۔ چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے الرسالہ میں سفرنامے چھاپے جارہے ہیں۔

یہاں میں دو باتیں کہوں گا—اللہ کے فضل سے الرسالہ کے دفتر میں مضامین کی کمی نہیں، بلکہ برعکس طور پر مضامین کی افراط ہے۔ اس وقت بھی دفتر میں اللہ کے فضل سے اتنے زیادہ غیر مطبوعہ مضامین موجود ہیں جو انشاء اللہ کئی سال کے لیے کافی ہوسکتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ الرسالہ کا سفرنامہ محض سفرنامہ نہیں ہوتا۔ وہ خود متنوع مضامین کا مجموعہ ہوتا ہے۔ کوئی شخص الرسالہ میں چھپے ہوئے کسی بھی سفرنامہ کو دیکھے اور قلم کاغذ لے کر اس کے موضوعات کو نوٹ کرے تو انشاء اللہ وہ پائے گا کہ اُس کے ہر صفحہ پر ایک نیا مضمون ہے۔ درحقیقت سفرنامہ اور دیگر مضامین دونوں اسلوب کے فرق کے ساتھ ایک ہی چیز ہیں۔ سفرنامہ بھی مضامین کا مجموعہ ہے، فرق صرف یہ ہے کہ اس کا اسلوب بدلا ہوا ہے۔ گویا کہ جو بات عام مضامین میں کتابی مطالعہ کے حوالہ سے لکھی جاتی ہے، وہی بات سفرنامہ میں سفری تجربات کی نسبت سے کہی جاتی ہے۔

۱۴ دسمبر کی صبح کو کانفرنس کا رسمی افتتاح ہوا۔ یہ افتتاح اشبیلیہ کی ایک نوتعمیر عمارت میں ہوا۔ یہ وسیع اور عالی شان عمارت مراکو کے کنگ کے تعاون سے بنائی گئی ہے۔ اس میں جدید طرز کا بہت بڑا ہال ہے۔ بلڈنگ کے چاروں طرف ہرے بھرے لان اس کی خوبصورتی کو بڑھا رہے ہیں۔ یہ خوبصورت عمارت مسلم عہد کے اسپینی طرز تعمیر پر بنائی گئی ہے۔ اس عمارت کا نام یہ ہے: کنگ حسن ثانی پویلین۔

۱۴ دسمبر کو افتتاح کے بعد گروپ ڈسکشن ہوئے۔ میں جس گروپ ڈسکشن میں شریک ہوا وہ مختلف مذاہب میں وزڈم (wisdom) کے تصور پر تھا۔ میں نے اپنی گفتگو میں بتایا کہ قرآن میں وزڈم کا تصور کیا ہے۔ قرآن میں وزڈم کو بہت اونچا درجہ دیا گیا ہے۔ تاہم قرآن کے مطابق، انسان کو علم قلیل دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے پاس غور وفکر کے لیے جو فریم ورک ہے وہ محدود ہے نہ کہ لامحدود۔ اس فطری حقیقت کو ماننے کے بعد ہی انسان وزڈم کے اعلیٰ درجہ تک پہنچ سکتا ہے۔

جولوگ اس حقیقت کو نہ مانیں وہ صرف کنفیوژن تک پہنچیں گے۔ ایسے لوگوں کے لیے اس دنیا میں صحیح معنوں میں عقلی ارتقاء مقدر نہیں۔

۱۴ دسمبر کو اشبیلیہ میں کنگ حسن ثانی پویلین میں جن لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں ان میں سے یروشلم کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ یہودی الون (Alon Goshen-Gottstein) تھے۔ ان سے اسلام کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ وہ اتنے ذہین تھے کہ چند جملوں میں پوری بات سمجھ جاتے تھے۔ میں نے کہا کہ اسلام کو سمجھنے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ آپ اسلام اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھیں:

You have to differentiate between Islam and Muslims.

پھر انہوں نے سوال کیا کہ موجودہ مسلمان اسلام کی غلط تصویر پیش کررہے ہیں تو اب مسلمانوں کے ریفارم کے لیے آپ کا فارمولا کیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ وہی فارمولا ہے جس کو حدیث میں احیاء (revival) کہا گیا ہے۔ یعنی مسلمانوں کے اندر دوبارہ اصل اسپرٹ پیدا کرنا۔

مزید گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ موجودہ مسلمانوں کا یہ ظاہرہ دراصل ڈی جنریشن (de-generation) کا ظاہرہ ہے جو ہر مذہبی گروہ میں پیش آتا ہے۔ خود یہودیوں میں بھی پیش آچکا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہر مذہبی گروہ کی پہلی نسل میں مذہب اپنی پوری اسپرٹ کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔ پھر نسل در نسل زوال شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ مذہب اپنی اصل روح سے الگ ہوجاتا ہے۔ وہ صرف ایک کلچر بن کر رہ جاتا ہے۔ اس وقت مسلمان (اور اسی طرح یہودی اور عیسائی بھی) اپنے اصل مذہب پر نہیں ہیں بلکہ بعد کے دور میں بنے ہوئے کلچر پر ہیں۔ ان میں فارم تو ہے مگر اصل روح گم ہوچکی ہے۔

انہوں نے اس تجزیہ سے اتفاق کرتے ہوئے پوچھا کہ آپ کا مشن اس سلسلہ میں کیا کررہا ہے۔ میں نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بتایا کہ ہمارا مشن یہی احیاء اسلام (revival of Islam) کا مشن ہے۔ ہم پچھلے چالیس سال سے یہی کام کررہے ہیں۔ خدا کے فضل سے ہزاروں لوگوں کی زندگیوں میں ایک نیا انقلاب آیا ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں میں بھی ہم نے بڑے پیمانہ پر یہ

کوشش کی ہے کہ انہیں اسلام کی اصل تعلیمات سے آگاہ کیا جائے۔ گفتگو کے آخر میں مسٹر الون کو ہمارے یہاں کی چند کتابیں دی گئیں۔ مثلاً:

In Search of God

Ideology of Peace

Spirituality in Islam

Tell Me About Prophet Musa

اس کانفرنس میں ونسنٹ کارنیل (Vincent J. Cornell) سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک مسیحی عالم ہیں۔ گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ انہوں نے اسلام اور قرآن کا صرف نام سنا ہے، انہوں نے اس کا مطالعہ نہیں کیا۔ اسلام کے بارے میں ان کی معلومات صرف ان پروگراموں تک محدود ہیں جو انہوں نے کبھی کبھی ٹی وی میں دیکھے ہیں۔

میں نے کہا کہ میں نے تو اسلام کے ساتھ مسیحیت کا بھی تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔ میں نے مسیحیت کے اوپر کئی مضامین بھی لکھے ہیں۔ اس سلسلہ میں میرا ایک مضمون وہ ہے جس کا عنوان ہے: کرشچینیٹی اینڈ اسلام (Christianity and Islam)۔ یہ مضمون دہلی سے چھپنے والی ایک کتاب میں شامل ہے۔ یہ کتاب ۱۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا نام یہ ہے:

Pilgrims to the Light (2000) Edited by Valson Thampu

انہوں نے کہا کہ جب آپ پختہ مسلمان ہیں تو آپ نے مسیحیت کا مطالعہ کیوں کیا۔ میں نے کہا کہ میرا تجربہ ہے کہ ایک ڈسپلن کو صحیح طور پر جاننے کے لیے دوسرے ڈسپلن کو بھی جاننا پڑتا ہے۔ اسی طرح ایک مذہب کو درست طور پر سمجھنے کے لیے دوسرے مذاہب کو سمجھنا ضروری ہے۔ مثلاً اسلامی تعلیم کے مطابق، میں مسیح کو خدا کا پیغمبر مانتا ہوں۔ پھر جب میں نے مسیحی لٹریچر میں پڑھا کہ مسیحی لوگ حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا بتاتے ہیں تو اس تقابل کے بعد مجھے یہ موقع ملا کہ میں اپنے عقیدہ کو زیادہ واضح طور پر ایک شعوری حقیقت کے طور پر دریافت کروں۔ انہوں نے میری بات غور سے سنی اور کہا کہ میں

بھی آئندہ اسی طرز مطالعہ کو اختیار کروں گا۔ یہی مذہبی مطالعہ کا صحیح طریقہ ہے۔

اسپین کے سفر میں کئی ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی جن کو مقامی مسلمان کہا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ایک ابوبکر اشبیلی تھے۔ ان سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ موجودہ اسپین میں تین قسم کے مسلمان پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو بزنس یا روزگار کے تحت یہاں کچھ مدت کے لیے آتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جن کو نومسلم کہا جاسکتا ہے۔ اسپین میں کوئی قابل ذکر دعوتی کام تو غالباً نہیں ہے مگر مختلف اسباب سے کچھ اسپینی باشندے مسلمان ہوگئے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ تیسری قسم ان مسلمانوں کی ہے جو مسلم دور سے چلے آرہے ہیں۔ پچھلی صدیوں میں خوف کی بنا پر انہوں نے اپنے دین کو چھپا رکھا تھا مگر اب حالات بدل گئے ہیں۔ یہاں مذہبی آزادی آگئی ہے، اس لیے قدیم مسلمان بھی اب کھلے طور پر اپنی شناخت کو بتانے لگے ہیں۔ تاہم لباس اور ظاہری وضع کے اعتبار سے ان مسلمانوں اور عام اسپینیوں میں کوئی فرق دکھائی نہیں دے گا۔ موجودہ اسپین میں ایسے اسپینی اسکالر پیدا ہورہے ہیں جو اپنی تقریر وتحریر میں اسلام کا غیر متعصّبانہ اعتراف کرتے ہیں۔

ایک میگزین دیکھا جس میں تحمل (patience) پر مختلف اقوال درج تھے۔ ان میں سے کچھ اقوال یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

1. Patience is the companion of wisdom.
2. Patience is the ability to wait for any expected outcome without tension and frustration.
3. Patience is the ability to wait for the gradual long lasting changes which take time and effort rather than impulsive quick changes.
4. Patience is the ability to develop the art of listening.
5. Patience is the ability to be thankful for what you already have, while you pursue all that you want.
6. Patience is a powerful tool in our hands.

(You can Change the World)

اسپین کی کانفرنس میں جو اہل علم اور اداروں کے نمائندے شریک ہوئے، ان کی تمام باتوں کا احاطہ اس سفر نامہ میں ممکن نہیں ہے۔ تاہم ان میں سے بعض حوالے یہاں نقل کیے جاتے ہیں تاکہ کانفرنس کے شرکاء کے خیالات کا ایک سرسری اندازہ ہو سکے۔

الون گوشن (Alon Goshen-Gottstein) ایک یہودی اسکالر ہیں۔ وہ یروشلم سے آئے تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ اسرائیل کی بنیادی شناخت یہ ہے — اپنے آپ سے آگاہی اور اپنے اور غیر میں فرق کا احساس:

Awareness of self and otherness is fundamental to Israel's identity.

میں نے اس کو سنا تو میں نے سوچا کہ یہودی نقطۂ نظر اور موجودہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر میں بڑی عجیب مشابہت ہے۔ موجودہ مسلم فکر بھی انہی دو اجزاء سے بنا ہے۔ ایک، اقبال کے الفاظ میں خودی کا تصور اور دوسرا وہ جس کو ملّی شناخت کہا جاتا ہے۔ مگر جہاں تک میں نے سمجھا ہے، مسلم ذہن حقیقی معنوں میں صرف ایک تصور سے بنتا ہے اور وہ خدا کی معرفت ہے۔ بقیہ تمام چیزیں اسی کے براہ راست یا بالواسطہ اجزاء کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اسٹفن اسکائز (Stephen Skyes) نے اپنی تقریر میں کہا کہ اگرچہ مسیح نے یہ تعلیم دی تھی کہ اپنے دشمن سے محبت کرو مگر مسیحیوں اور دوسروں میں اختلافات کے نتیجہ میں دونوں کے درمیان نفرت کی سیاست نے جنم لیا:

Despite Jesus' teaching of love of the enemy, the marks of such historical opposition between Christians and others have given and continue to give rise to exclusionary politics of hatred.

اس مسئلہ کا تعلق صرف مسیحیت سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ہر مذہب سے ہے۔ آج تمام مذہبوں کا یہ حال ہے کہ ان کی مقدس کتابوں میں تو امن اور محبت کی باتیں لکھی ہوئی ہیں مگر مذہب کے ماننے والوں نے اپنے مادی مفادات کی بنا پر، نہ کہ مذہب کی اصولی تعلیم کی بنا پر، دوسرے گروہوں سے مادی لڑائی چھیڑ رکھی ہے۔ یہ ظاہرہ خود مسلمانوں کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ ہنٹنگٹن

(Samuel P. Huntington) نے اپنی کتاب تہذیبوں کا تصادم (Clash of Civilizations) میں تہذیبوں کے تصادم کی بات کہی ہے۔ مگر حقیقۃً یہ اہل تہذیب کا تصادم ہے نہ کہ خود تہذیب کا تصادم یا ٹکراؤ۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ہنٹنگٹن کی کتاب کا زیادہ صحیح نام یہ ہونا چاہیے:

Clash of Peoples of Civilizations

ونسنٹ کارنل (Vincent Cornell) نے اپنے پیپر میں دوسری باتوں کے علاوہ ایک بات یہ کہی کہ اسلام ایک ٹائم بم کے اوپر بیٹھا ہوا ہے جو کسی بھی وقت یا تو اپنے داخلی سبب سے پھٹ سکتا ہے یا کسی عالمی سبب سے:

Islam is sitting on a time bomb that may explode to its own detriment and that of the world at large.

جو بات اس اقتباس میں اسلام کے بارے میں کہی گئی ہے وہ مسلم گروہ کے بارے میں درست ہوسکتی ہے بلکہ شاید وہ درست ثابت ہورہی ہے۔ مگر جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس کا معاملہ مسلمانوں سے الگ ہے۔ اس قسم کے تمام خطرات کا تعلق گروہ مسلم سے ہے نہ کہ مذہب اسلام سے۔

اشوک ووہرا (Ashok Vohra) نے ہندوازم کے بارے میں اپنے خیالات پیش کئے۔ انہوں نے ایک بات یہ کہی کہ انسانی ہمدردی ہندو مذہب کا فطری مزاج ہے۔ اس کی بنیاد تمام زندہ چیزوں کی فوق الفطری یکسانیت میں پائی جاتی ہے:

Hospitality is the natural state of the Hindu mentality, founded as it is upon a recognition of the metaphysical unity of all life.

مقرر کا مطلب یہ تھا کہ ہندوازم کے مطابق، انسان اور خالق انسان دونوں ایک ہی حقیقت کے اجزاء ہیں۔ اس لیے ہندوازم میں ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان ہمدردی اور محبت ایک فطری تقاضہ ہے۔ یہ بات تقریباً تمام ہندو مفکرین کہتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ عملاً ایسا کیوں نہیں۔ سوامی وویکا نند نے اعتراف کیا ہے کہ عملی ادوئت واد جو کہ تمام انسانوں کو ایک روح کے طور پر سمجھتی ہے، ہندوؤں کے درمیان کبھی عملاً وجود میں نہ آسکا:

Yet practical advaitism, which looks upon and behaves to all mankind as one's own soul, was never developed among the Hindus. *Letters of Swami Vivekananda* (p. 379)

بدھسٹ اسکالر رچرڈ ہیز (Richard Hayes) نے اپنے پیپر میں جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ بدھسٹ نقطۂ نظر تمام عداوتوں کی جڑ غیر صحیح فہم میں سمجھتا ہے جو کہ ذہن کی تنظیم سے دور ہوسکتا ہے:

> The Buddhist perspective too sees the root of all hostility in an inappropriate understanding that must be corrected through discipline of the mind.

یہ بات عین فطرت کے مطابق ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام منفی خیالات ابتداءً دماغ میں پیدا ہوتے ہیں اور پھر وہ واقعہ بنتے ہیں۔ اس لیے اس معاملہ میں اصلاح کا آغاز ذہن کی اصلاح سے ہی ہوسکتا ہے۔

راقم الحروف نے اس موقع پر جو باتیں کہیں ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ پیغمبر اسلام نے اپنے ایک ارشاد میں فرمایا: **الا کلکم بنو آدم و آدم من تراب** (سنو کہ تم میں سے ہر ایک آدم کی اولاد ہے اور آدم مٹی سے تھے):

All of you are children of Adam and Adam was created from clay.

میں نے کہا کہ یہ ایک نہایت جامع ارشاد ہے۔ اس قول کے پہلے جزء کا مطلب ہے یونیورسل برادرہڈ (universal brotherhood) اور اس کے دوسرے جزء کا مطلب ہے مساوات۔ پہلی بات سے تمام مثبت احساسات جنم لیتے ہیں۔ اور دوسری بات کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام منفی احساسات دل سے نکل جاتے ہیں۔

۱۴ دسمبر کے دوپہر کا کھانا ایک بڑی عمارت کے اندر کھایا گیا۔ اس کو کسی قدیم بادشاہ نے اپنی رہائش گاہ کے طور پر بنایا تھا۔ یہ عمارت بہت زیادہ وسیع تھی۔ اس میں بڑے بڑے لان تھے۔ اس پوری عمارت کو دوبارہ اس طرح آراستہ کیا گیا ہے کہ اس کا قدیم طرز پوری طرح باقی ہے۔ اسی کے

ساتھ اس میں جدید سہولتیں پوری طرح موجود ہیں۔ مثلاً ہموار راستے، پانی کا انتظام، صاف ستھرے باتھ روم، وغیرہ۔

قدیم مسلم عہد کی ان عمارتوں کو دیکھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ مسلم سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں ان کا ذکر ''برباد ماضی'' کے عنوان کے تحت کیا ہے۔ مگر میں نے اس کو دیکھا تو مجھے خیال آیا کہ یہ تو تجدید ماضی کا واقعہ ہے۔ جدید حالات نے خود اسپین کے اندر یہ داعیہ پیدا کیا کہ وہ ان مسلم یادگاروں کو دوبارہ سجائیں۔ یہ سجانا مسلم عہد کے نام سے ہوا ہے۔ کیوں کہ اگر ان سے مسلم عہد کی یادگار کا لفظ نکال دیا جائے تو ان کی تاریخی حیثیت ختم ہو جائے گی اور ان کی تاریخی حیثیت کا ختم ہونا اسپین کی حکومت کے سیاحتی مفاد میں نہیں۔

۱۴ دسمبر ۲۰۰۳ کو جب کہ میں اسپین میں تھا ایک سنسنی خیز خبر میڈیا کے ذریعہ معلوم ہوئی۔ وہ عراق کے سابق صدر صدام حسین کی گرفتاری تھی۔ یہ واقعہ عراق میں ہوا مگر جدید کمیونیکیشن کے ذریعہ منٹوں کے اندر اس کی خبر ساری دنیا میں پھیل گئی۔ ہر جگہ بس اسی کا چرچا ہونے لگا۔ اس خبر کا خلاصہ ایک اخبار سے لے کر یہاں نقل کیا جاتا ہے:

امریکی فوج نے سابق عراقی صدر صدام حسین کو اُن کے آبائی وطن تکریت میں چھاپہ مار کر زندہ گرفتار کر لیا۔ عراق میں امریکی انتظامیہ نے اس کی اطلاع دی۔ بغداد میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے عراق میں امریکی انتظام کار پال بریمر (Paul Bremer) نے سابق عراقی صدر صدام حسین کی گرفتاری کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ خواتین وحضرات ہم نے صدام کو پکڑ لیا:

Ladies and gentlemen, we got Saddam Husain.

اس پریس کانفرنس کے دوران ایک ویڈیو دکھایا گیا جس میں صدام حسین لمبے بکھرے سفید بال اور گھنی داڑھی رکھے نظر آئے۔ امریکی فوج کے لفٹننٹ جنرل ریکارڈو سینچیز (Lt. Gen. Recardo Sanchez) نے بتایا کہ کئی ماہ کے دوران جمع کی گئی انٹلی جنس رپورٹ کی بنیاد پر یہ چھاپا مارا گیا جس کا نام ''آپریشن ریڈ ڈان'' تھا۔ اس چھاپے میں ایک بھی گولی نہیں چلانی پڑی۔ اس آپریشن میں کُل چھ سو سے زائد

فوجیوں نے حصہ لیا۔ امریکی افسر نے بتایا کہ جب امریکی فوج نے صدام حسین کو گھیرے میں لیا تو ان کی طرف سے کوئی بھی مزاحمت نہیں ہوئی۔ امریکی آفیشیل نے مزید جانکاری دی کہ جہاں صدام حسین چھپے ہوئے تھے وہاں سے ۳، اے کے۔ ۴۷ رائفلیں اور ۷۵ ہزار امریکی ڈالر برآمد ہوئے ہیں۔

''خبروں کے مطابق، جب امریکی فوج ان کے مقام پر پہنچی تو وہ ایک فارم ہاؤس کے بنکر میں چھپے ہوئے تھے۔ صدام کی گرفتاری کے فوراً بعد ان کی شناخت کی جانچ کے لیے ان کا ڈی این اے ٹسٹ کیا گیا جس سے یہ ثابت ہوگیا کہ گرفتار کیا جانے والا شخص ہی صدام حسین ہے۔ ۱۹ اپریل ۲۰۰۳ کو صدام کو معزول کیے جانے کے بعد سے عراق میں اتحادی فوجوں پر مسلسل حملے ہورہے تھے۔ صدام حسین نے اپنے بیٹوں عدی اور قصی کی امریکی فوج کے ہاتھوں موت کے بعد بھی اپنے پوشیدہ ٹھکانوں سے امریکیوں کے خلاف حملوں کی اپیلیں جاری رکھی تھیں۔

امریکا نے صدام حسین کی گرفتاری کے لیے ۲۵ ملین ڈالر کا انعام رکھا تھا۔ عُدی اور قُصی کی موصل میں موجودگی کی خبر دینے والے مخبر کو ۳۰ ملین ڈالر کے علاوہ امریکا میں پناہ (asylum) دی گئی ہے۔ ۶۶ سالہ سابق عراقی صدر ۹ اپریل ۲۰۰۳ سے مفرور تھے جب سے امریکا نے بغداد پر قبضہ کیا تھا۔ وہ امریکا کے ۵۵ مطلوبہ لوگوں کی لسٹ میں سرفہرست تھے۔

۱۵ دسمبر کا دن کانفرنس کے منتظمین نے اشبیلیہ کی تاریخی عمارتوں کو دیکھنے کے لیے خاص کیا تھا۔ تمام شرکاء جدید طرز کی دو بسوں پر سوار ہوکر مختلف عمارتوں کو دیکھتے رہے۔ یہ سب مسلم عہد کی عمارتیں تھیں۔ مسلم عہد کے خاتمہ کے بعد ان عمارتوں کا حال وہ ہوگیا تھا جس کی تصویر کشی الطاف حسین حالی نے اپنے اس شعر میں کی ہے:

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے　　مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے

مگر پچھلے پچیس سالوں میں حالات بہت بدل گئے ہیں۔ یہ سیاحت کی انڈسٹری کا کرشمہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں سیاحت کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اسپین میں سیاحوں کی دلچسپی کا سب سے بڑا مرکز مسلم عہد کی عمارتیں تھیں۔ ان عمارتوں میں اب اقتصادی قیمت (commercial value) پیدا

ہوگئی ہے۔ جب کہ اس سے پہلے وہ صرف خارجی حملہ آوروں کی علامت کے طور پر دیکھی جاتی تھیں۔ چنانچہ اس جدید ضرورت کے تحت اسپین کی حکومت نے ان قدیم عمارتوں کو دوبارہ آراستہ کیا۔ ان کے اندر جو ٹوٹ پھوٹ آئی تھی ان کو مرمت کرکے اس کو از سر نو شاندار بنا دیا گیا۔ چنانچہ یہاں ساری دنیا کے سیاح کثرت سے آتے ہیں۔ سیاحت اسپین کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ ایک وسیع محل میں میں نے دیکھا کہ قدیم طرز کی شاہی گھوڑا گاڑی موجود تھی اور سیّاح اُس کے اوپر بطور تفنن محل کے مختلف حصوں کا سفر کررہے تھے۔

الطاف حسین حالی نے اسپین کے ان ''کھنڈروں'' کے بارے میں لکھا تھا کہ اگرچہ اب وہ کھنڈر ہو چکے ہیں مگر اب بھی ان کے اندر ماضی کی شان وشوکت جھلک رہی ہے:

جلال ان کے کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

حالی اور اس قسم کے دوسرے لوگوں نے ان ''کھنڈروں'' میں صرف ماضی کی بربادشدہ عظمت کی جھلک دیکھی تھی۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک منفی نقطۂ نظر ہے۔ میں اپنے مزاج کے تحت تاریخ کو مسلم اور غیر مسلم کے خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھتا۔ میں تاریخ کو انسانیت کے ایک تسلسل کے روپ میں دیکھتا ہوں۔ اس لیے جب میں نے مسلم عہد کی قدیم طرز کی عمارتوں کو دیکھا اور دوسری طرف جدید طرز کی سڑکوں کے کنارے جدید طرز کی بلند بالا بلڈنگوں کو دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں انسانی ترقی کے ارتقائی عمل کو دیکھ رہا ہوں۔ میرے دل نے کہا کہ مسلمانوں نے اسپین میں ترقی کی ابتدائی بنیاد رکھی تھی۔ بعد کے لوگ اب اس کے اوپر اس کی اگلی منزلیں تعمیر کررہے ہیں اور ظاہر ہے کہ بنیاد کے بغیر کوئی اگلی تعمیر کھڑی نہیں کی جاسکتی۔

اشبیلیہ میں سعودی عرب کے تعاون سے ایک شاندار عمارت بنائی گئی ہے۔ یہ گویا اسلامک کلچرل سنٹر ہے۔ اس سنٹر کا نام یہ ہے:

کنگ فہد سنٹر فار مڈل ایسٹ اینڈ اسلامک اسٹڈیز

اس ادارہ کے ڈائرکٹر سے ملاقات ہوئی۔ ان سے عالم اسلام کے موجودہ حالات پر گفتگو

ہوئی۔ دوسرے مسلمانوں کی طرح ان کا خیال بھی یہ تھا کہ آج کی مسلم دنیا غیر اقوام کی سازشوں کا شکار ہے۔ میں نے کہا کہ سازش کسی غیر قوم کی تخلیق نہیں وہ خود خالق کے تخلیقی نقشہ کا ایک حصہ ہے۔ اس دنیا میں سازش ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اس کے مقابلہ میں تدبیر کا انداز اختیار کرنا چاہیے نہ کہ شکایت اور احتجاج کا انداز۔ انہوں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ یہ میرے لیے ایک نیا نقطۂ نظر ہے۔ میں اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کروں گا۔

اس کانفرنس کو اصلاً جس ادارہ نے آرگنائز کیا اس کا نام یہ تھا:

The Elijah Interfaith Institute

اس ادارہ کے تعارفی پمفلٹ میں اس کے بارے میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

The Elijah Interfaith Institute is dedicated to fostering peace among faith communities worldwide through interfaith dialogue, education, research and dissemination.

اسپین کی اس کانفرنس میں شری روی روی شنکر بھی شریک تھے۔ ان کی ایک مخصوص فلاسفی ہے جس کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ دنیا بھر میں ۲۰ ملین آدمی کو اس سے فائدہ پہنچ رہا ہے۔ انہوں نے ایک اخباری انٹرویو دیا۔ اس انٹرویو میں ایک سوال یہ تھا کہ زندگی میں آپ کا مشن کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ زیادہ سے زیادہ چہرے پر مسکراہٹ لے آنا:

To put a smile on as many faces as possible.

ایک سوال یہ تھا کہ جو لوگ امن اور خوشی چاہتے ہیں ان کے لیے آپ کی ایڈوائس کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا:

Get rid of stress, know that peace is there where you are and that it is in your heart. Peace is your very nature.

میرے نزدیک یہ ایک مبہم جواب ہے۔ اس جواب میں سائل کو واضح رہنمائی نہیں ملتی۔ اس سے بھی زیادہ مبہم ان کا آخری سوال و جواب تھا۔ انٹرویور نے خاتمہ پر پوچھا۔ قارئین کے لیے آپ کا

آخری پیغام کیا ہے۔انہوں نے جواب دیا:

Compare the problem to a dog, the solution is its tail, if you don't see its tail, just wait for a while, it will wag itself. Then you will see the solution.

اس جواب کو میں نے کئی بار پڑھا۔مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بظاہر وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ مسئلہ کا حل اپنے آپ آتا ہے۔مگر انہوں نے اس کے لیے کتے کی دم کی جو مثال دی ہے اس مثال کا کوئی تعلق اس جواب سے نظر نہیں آتا۔

تائیوان سے ایک صاحب آئے تھے جو شنٹو مذہب کے دھرم ماسٹر کہے جاتے تھے۔ان کا نام سین تاؤ(Hsin Tao) تھا۔انہوں نے بتایا کہ انہوں نے تائیوان میں عالمی مذاہب کا ایک میوزیم قائم کیا ہے جس کا نام ہے(Museum of World Religions)۔اس کا مقصد انہوں نے یہ بتایا:

In order to encourage the exchange of ideas and mutual respect between different cultures and religions, and thereby to avert war and conflict, the Museum of World Religions was born.

اسپین کا مشہور اخبار اے بی سی ڈی سیول(ABC DE Seville) ہے۔اس کے شمارہ ۱۷ دسمبر ۲۰۰۳ میں کانفرنس کی تفصیلی رپورٹ چھپی۔ یہ رپورٹ اسپینی زبان میں تھی۔اس لیے میں اس کو سمجھ نہیں سکا۔البتہ ایک چیز اس رپورٹ میں واضح تھی۔ وہ یہ کہ میری تصویر کو انہوں نے سب سے زیادہ نمایاں انداز میں پیش کیا تھا۔تصویر کے ساتھ اخبار نے کانفرنس کے ڈیکلریشن (Seville Declaration) کو شائع کیا تھا۔

میری اس تصویر کے بیک گراؤنڈ میں پتھر کی ایک دیوار دکھائی دیتی ہے۔ یہ مسلم دور کے ایک محل کی دیوار ہے۔اس قسم کی قدیم عمارتیں یہاں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ان عمارتوں کو جو پہلے غیر آباد پڑی ہوئی تھیں، ان کی پھر سے تجدید کی گئی ہے اور ان میں جدید سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔مثلاً جگہ جگہ عمدہ نشستوں کا انتظام، صاف ستھرے باتھ روم، جدید طرز کی عمدہ سڑکیں، عمارت سے متصل پارک اور باغ اور ان کے مینٹیننس کا انتظام، وغیرہ۔

اسپین (اندلس) میں ایک علاقہ کا نام وادیٔ الکبیر ہے۔ یہاں قدیم طرز کا ایک اونچا ٹاور ہے جس کو قلعۃ الحر کہا جاتا ہے۔ وہ باہر سے ناتراشیدہ پتھروں کا ایک اونچا ٹاور معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اندر سے اس کو جدید انداز میں آراستہ کیا گیا ہے۔ اس کو ہم نے تفصیل کے ساتھ دیکھا۔ یہ ٹاور اتنا بڑا تھا کہ اس کے ایک فلور پر کئی کئی کمرے تھے۔ اس وقت اس کو مسلم میوزیم کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور وہ نوڈو فاؤنڈیشن کے زیر انتظام ہے۔ اس میں مسلم اسپین کے تمام تاریخی عمارتوں کے عمدہ ماڈل بنا کر رکھے گئے ہیں۔ مثلاً الحمراء کا ماڈل، مسجد قرطبہ کا ماڈل، وغیرہ۔ یہ ماڈل فنی اصول پر معیاری انداز میں بنائے گئے ہیں۔ اسی طرح اس میں عرب دور کے بہت سے قدیم مخطوطات رکھے ہوئے تھے۔ اس میں ساؤنڈ سسٹم اس طرح بنایا گیا تھا کہ وہاں گائڈ کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے بجائے ہر وزیٹر کو ایک ہیڈ سیٹ دیا جاتا تھا۔ اس ہیڈ سٹ کے ذریعہ وزیٹر جس ماڈل کو دیکھ رہا ہوتا اس کے بارہ میں اس کو اپنی مطلوب زبان میں معلومات ملتی رہتی تھی۔ ہیڈ سٹ کے اس طریقہ کا یہ فائدہ تھا کہ وہاں آواز کا کوئی شور نہیں تھا بلکہ ہر شخص دھیمی آواز میں اپنی مطلوب معلومات لیتا رہتا تھا۔

اس کانفرنس میں مختلف مذہبوں کے نمائندے موجود تھے۔ یہودیت کی نمائندگی کرنے کے لیے یہاں اسرائیل کے چیف ربائی شلوموامَر (Shlomo Amar) بھی شریک تھے۔ زبان اور طرز ادا کے اعتبار سے ان کی تقریر ایک اچھی تقریر کہی جاسکتی ہے۔ انہوں نے ٹکراؤ کے ماحول کو ختم کرنے کی پرزور وکالت کرتے ہوئے کہا: ہم اس دنیا میں اس لیے آئے ہیں کہ ہم مل جل کر زندگی گزاریں نہ یہ کہ آپس میں لڑ کر مر جائیں:

We are here to live together not to die together.

اب سوال یہ ہے کہ یہ مقصد کس طرح حاصل ہو۔ جواب یہ ہے کہ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے ذریعہ سے۔

اس کانفرنس میں پنڈت روی روی شنکر بھی شریک تھے۔ ان کے لیے وی آئی پی کھانے کا انتظام ان کے مقامی شاگرد کرتے تھے۔ کھانے کے وقت وہ خود اپنے ہاتھ سے میرے لیے یہ

وتجیٹیر ین کھانا لے کر آتے اور شوق کے ساتھ مجھ کو کھلاتے۔

میں یہ جانتا ہوں کہ روی روی شنکر کے نظریات درست نہیں ہیں۔ اس معاملہ میں اُن سے ایک بار تفصیل کے ساتھ میری بات بھی ہو چکی ہے۔ یہ گفتگو کئی لوگوں کی موجودگی میں ہوئی تھی۔ یہ لوگ اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ میرے سوالات کا جواب دینے سے عاجز رہے۔ مگر اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ بہت مقبول گرو ہیں۔ میرے تجربہ کے مطابق، ان کی مقبولیت کا خاص سبب اُن کی خوش اخلاقی ہے۔ اس معاملہ میں غالباً شاعر کا وہ شعر درست آتا ہے جس میں اُس نے شراب خانہ میں لوگوں کی بھیڑ کا سبب یہ بتایا تھا:

فقط یہ بات کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق

۱۸ دسمبر کو کانفرنس کے تمام شرکاء اشبیلیہ سے قرطبہ لے جائے گئے۔ یہ پورا سفر سرسبز وادیوں میں طے ہوا۔ سڑک نہایت عمدہ تھی۔ درمیان میں بعض تاریخی مقامات کو دیکھنے کے لیے ہم لوگ رکے۔ اسپین کا پورا ملک، خاص طور پر اندلس تاریخی یادگاروں سے بھرا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں سیّاح لوگ نہایت کثرت سے آتے ہیں۔

اسپین کی آب و ہوا بھی بہت اچھی ہے۔ یورپ کے دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں اسپین نسبتاً معتدل آب و ہوا کا ملک سمجھا جاتا ہے۔ راستہ میں ہم ایک مقام پر ٹھہرے۔ یہاں ایک بہت بڑی تاریخی عمارت تھی۔ یہ عمارت سیاحوں سے بھری ہوئی تھی۔ خاص طور پر لڑکے اور لڑکیاں کثرت سے دکھائی دیتی تھیں۔ مگر وہاں کوئی شور نہ تھا۔ یہ لوگ متحرک مجسموں کی طرح ادھر ادھر جاتے ہوئے نظر آتے تھے۔

یہ منظر ہندستان کے سیاحتی مقامات سے بہت مختلف تھا۔ ہندستان میں عام طور پر ایسے مقامات پر دو چیزیں عام ہیں۔ ایک، شور وغل، اور دوسرے، کھانے پینے کی چیزوں کے خالی پیکٹ۔ اس طرح چلتے ہوئے ہم لوگ قرطبہ پہنچے تو وہاں دوپہر بعد کا وقت ہو چکا تھا۔ قرطبہ میں بہت سی تاریخی عمارتیں ہیں مگر سب سے زیادہ مشہور مسجد قرطبہ اور مسیحی کیتھیڈرل ہے۔

قرطبہ میں ہم کو سیاحت کے ڈپارٹمنٹ کی طرف سے مختلف لٹریچر دئے گئے۔ ایک پمفلٹ کے ٹائٹل پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

Brief Guide to the Holy Cathedral Church
Former Mosque of Cordoba.

اس میں بتایا گیا تھا کہ قرطبہ میں مسلم عہد سے پہلے ایک گرجا ہال (basilica) تھا۔ عبدالرحمٰن اوّل نے اس کو توڑ کر اس کی جگہ مسجد قرطبہ بنائی جو پمفلٹ کے مطابق، مغربی دنیا میں پہلی مسلم عبادتی عمارت تھی۔ مسلم عہد کے خاتمہ پر عیسائی بشپ انجلو (Martin Fernandez de Angulo) کے حکم سے سولہویں صدی میں اس مسجد کو دوبارہ کیتھیڈرل میں تبدیل کیا گیا۔

اس مسجد کو میں نے تفصیل کے ساتھ دیکھا۔ یہ مسجد بہت بڑی تھی اور تعمیر کے اعتبار سے نہایت خوبصورت اور پرشکوہ انداز میں بنائی گئی تھی۔ دیکھنے کے بعد جہاں تک میں نے اندازہ کیا مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مسلم عہد کے خاتمہ کے بعد مسجد کو توڑا نہیں گیا البتہ اُس کے تقریباً نصف حصہ کو چرچ میں تبدیل کر دیا گیا اور بقیہ نصف حصہ مسجد کی صورت میں باقی رہا۔ امام کے کھڑے ہونے کی جگہ اب بھی پہلے کی طرح ہے اور نہایت شاندار انداز میں بنائی گئی ہے۔ وسیع محراب پر سونے کا کام بنا ہوا تھا۔ اُس کے قریب جانے پر پابندی تھی۔

قرطبہ میں ہم کو ایک گلی میں لے جایا گیا۔ اس گلی میں کار نہیں گذر سکتی۔ یہاں پیدل جانا ہوتا ہے۔ اس گلی کے اندر ہم کو ایک گھر دکھایا گیا۔ یہ مسلم عہد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس گھر کو ایک فرانسیسی نو مسلم خاتون نے خرید لیا ہے۔ ان خاتون کا نام عائشہ ہے۔ اس گھر میں قدیم عربی انداز میں ہماری تواضع کی گئی۔

قدیم طرز کے بنے ہوئے اس گھر کے ہر حصہ میں مسلم عہد کی یادگاریں نمائش کے لیے رکھی گئی تھیں۔ لوگ دیر تک اُن کو دیکھتے رہے۔ اس گھر کو اس کی قدیم صورت پر برقرار رکھا گیا ہے۔ یہ گھر صاف ستھرا تھا مگر اُس کے کمرے چھوٹے تھے۔ کھڑکیاں بہت کم تھیں۔ فرش بھی آج کل کی طرح ہموار

نہ تھا۔ گھر کے افراد میں کوئی عربی جاننے والا نہیں ملا۔ یہ لوگ اسپینی زبان بولتے تھے۔ اسی کے ساتھ وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی بول سکتے تھے۔ تاہم ترجمان نے یہ کمی پوری کردی۔

قرطبہ ایک قدیم شہر ہے جو اندلس کے علاقہ میں واقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بائبل میں ترشیش (Tarshish) کے نام سے جس بستی کا ذکر ہے وہ یہی قرطبہ ہے۔ قرطبہ ۱۵۲ ق م میں رومی نوآبادیات کے طور پر قائم کیا گیا۔ جولیس سیزر (Julius Ceaser) نے ۴۵ ق م میں اس شہر پر حملہ کیا اور وہاں کے بیس ہزار افراد کو مار ڈالا۔ لوکان (Lucan) اور بشپ ہاسیس (Hosius) اسی قرطبہ میں پیدا ہوئے جنہوں نے شاہ قسطنطین کو مسیحی بنانے میں اہم رول ادا کیا۔

قرطبہ میں مسلمانوں کی حکومت ۷۵۶ سے ۱۲۳۶ تک رہی۔ عبدالرحمٰن اول نے ۷۵۶ میں قرطبہ کو اپنی اسپینی سلطنت کی راجدھانی بنایا۔ مسجد قرطبہ کی بنیاد اسی عبدالرحمٰن اول نے رکھی جس کو اس کے جانشینوں نے ۹۷۶ میں مکمل کیا۔ اموی سلطنت کے زمانہ میں قرطبہ یورپ کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ شہر سمجھا جاتا تھا۔

اُس زمانہ میں قرطبہ مشرق ومغرب کے لیے علم کا مرکز بن گیا تھا۔ اس نسبت سے میں تقریباً ہر دن قرطبہ کو یاد کرتا ہوں۔ اس لیے کہ قرطبی علماء کی دوسری کتابوں کے علاوہ میرے پاس ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی (وفات ۶۷۱ھ) کی عربی تفسیر **الجامع لأحکام القرآن** موجود ہے جس کو میں تقریباً روزانہ دیکھتا ہوں۔ یہ تفسیر بیس جلدوں میں ہے اور جامع تفسیروں میں شمار ہوتی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر یہ تفسیر کافی پسند ہے۔ یہ تفسیر مجھے ایک عرب شیخ نے تحفہ میں دی تھی۔

سید رشید رضا نے اپنی کتاب میں مسلم اسپین کی شان وشوکت بتاتے ہوئے لکھا ہے:

''شہر قرطبہ کا تصور کیجئے جسے ''یورپ کی دلہن'' کہنا بجا ہوگا۔ یہاں کی جامع مسجد کی وسعت کا اندازہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ اس کے اندرونی حصے میں پچاس ہزار اور صحن میں تیس ہزار لوگ آسانی سے نماز پڑھ سکتے تھے۔ جامع مسجد کے علاوہ باقی مسجدوں کی تعداد سات سو تھی''۔

جوش اور فخر سے بھری ہوئی اس قسم کی سطروں کے بعد سید رشید رضا لکھتے ہیں:

''جب میں غرناطہ کے الزّہراء محل کو دیکھنے گیا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، گویا میں نے محل نہیں دیکھا بلکہ ایک مکمّل شہر دیکھا۔ اس کی لمبائی نو سو میٹر اور چوڑائی آٹھ سو میٹر تھی۔ اہل ہسپانیہ اس محل کو ''شہر زہراء'' کے نام سے پکارتے ہیں۔

اگر ہم دوسرے شہروں کو چھوڑ کر صرف غرناطہ ہی کو لے لیں جو یورپ میں مسلمانوں کی سب سے چھوٹی سلطنت کا دارالخلافہ تھا تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ پندرہویں صدی عیسوی تک یورپ میں اتنا عظیم الشان اور بارونق شہر کوئی نہ تھا۔ جس زمانے میں ہسپانیوں نے اس شہر کو فتح کیا تھا، اس کی آبادی پچاس ہزار تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ تمام یورپ میں ایک بھی ایسا شہر نہ ملتا تھا جو غرناطہ کی نصف آبادی ہی کے برابر ہوتا۔ پھر الحمراء کے عظیم الشان محل کی طرف توجہ کیجئے۔ اس کی تعریف میں صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ تمام روئے زمین پر اس کی کوئی مثال نظر نہیں آتی''۔

موجودہ زمانہ کے تقریباً تمام مسلم رہنما اسی قسم کی بات لکھتے اور بولتے رہے ہیں۔ مگر یہ طریقہ خود مسلمانوں کے لیے سخت تباہ کن ہے۔ یہ لوگ مشترک طور پر یہ غلطی کرتے ہیں کہ وہ قدیم یورپی قوموں کا تقابل قدیم مسلمانوں سے کر کے مسلمانوں کو فخر کی غذا دیتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس صحیح طریقہ یہ ہے کہ قدیم عہد کی مسلم ترقیوں کا تقابل جدید یورپ کی ترقیوں سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قدیم مسلمان آج کی یورپی ترقی سے اتنا ہی پیچھے ہیں جتنا کہ قدیم زمانہ میں دوسری قومیں مسلمانوں سے پیچھے تھیں۔ سید رشید رضا اور دوسرے لوگوں کے تقابل میں یہ غلطی ہے کہ وہ مسلم تاریخ کے زمانۂ اختتام کو لے رہے ہیں اور یورپی تاریخ کے زمانۂ آغاز کو۔ یہ ایک غیر منصفانہ تقابل ہے۔ ایسا تقابل دین کے خلاف بھی ہے اور عقل کے خلاف بھی۔

یہ غلط تقابل مسلمانوں کے لیے سخت تباہ کن ہے۔ غلط تقابل سے آج کے مسلمانوں کو فرضی فخر کی غذا ملتی ہے۔ وہ غیر حقیقی طور پر پدرم سلطان بود کی فرضی نفسیات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس

اگر صحیح تقابل کیا جائے تو آج کے مسلمانوں کے اندر عمل کا جذبہ پیدا ہوگا۔ وہ اپنے پچھڑے پن کو دور کرنے کی کوشش کریں گے نہ کہ مفروضہ طور پر اپنے کو آگے سمجھ کر اس پر بے بنیاد فخر کرتے رہیں۔

کارمونا (Carmona) اسپین کا ایک قدیم شہر ہے۔ ۱۷ دسمبر کو کانفرنس کے تمام شرکاء یہاں لے جائے گئے اور یہاں کے میئر کی طرف سے انہیں الوداعی خطاب کیا گیا۔ یہاں قدیم زمانہ کا ایک بہت بڑا قلعہ ہے۔ یہ قلعہ مسلم عہد میں بنا تھا۔ اس قلعہ کے اندر الوداعی تقریبات انجام پائیں۔ اس قلعہ کو از سر نو آراستہ کر کے اس کو شاندار بنا دیا گیا ہے۔

۷۱۳ء میں موسیٰ بن نُصیر نے کارمونا کو فتح کیا۔ اس کے بعد سے وہ مسلم اندلس کا ایک حصہ بن گیا۔ یہاں آباد ہونے والے عرب اور بربر نے اس کا نام کارمونا رکھا۔ کارمونا کے میئر کی طرف سے ہمیں جو کتابیں اور پمفلیٹ دئے گئے ان میں سے ایک میں یہ لکھا ہوا تھا۔ اس فتح کے بعد شہر کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ فاتح اور مفتوح امن کے ساتھ مل جل کر رہنے لگے۔ یہاں تک کہ اکثریت نے اسلام کے کلچر کو اختیار کر لیا:

Thus began a new golden age for the city which became a cultural crossroad where the Arabs and Berber conquerors lived peacefully beside the conquered Hispano-Visigothic population untill the majority finally embraced the culture of Islam.

اشبیلیہ کی کانفرنس (۱۴۔۱۷ دسمبر ۲۰۰۳) کے خاتمہ پر ایک ڈکلریشن جاری کیا گیا۔ اس ڈکلریشن کے پانچ پوائنٹ تھے۔ اس میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ پانچ بڑے عالمی مذاہب کے نمائندے جو اشبیلیہ میں جمع ہوئے تھے وہ مشترک طور پر یہ اپیل کرتے ہیں کہ ہر مذہب کے ذمہ دار ایسے اقدامات کریں جو مذہبی ہم آہنگی کو فروغ دینے والا ہو۔

یہ ڈکلریشن بجائے خود بلاشبہہ اچھے جذبات کا اظہار تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ ایسے سینکڑوں ڈکلریشن جاری کیے گئے مگر مذاہب کے درمیان مطلوب فضا اب تک قائم نہ ہو سکی۔ میرے تجربہ کے مطابق، اس مقصد کے لیے کانفرنس کے اجتماعی خطاب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ افراد کے اندر

مطلوب ذہن بنانے کی کوشش کی جائے۔ یہ مقصد حقیقۃً افراد کی ذہن سازی کے ذریعہ حاصل ہوگا، نہ کہ اجتماعی خطابات سے۔

۱۸ دسمبر کی شام کو اشبیلیہ سے واپسی کا سفر ہوا۔ اشبیلیہ ایر پورٹ سے آئبیرین ایر لائنز کے ذریعہ ہم لوگ بارسلونا پہنچے۔ یہ سفر ایک چھوٹے جہاز کے ذریعہ طے ہوا۔ اس کے مسافر تقریباً ۹۹ فیصد یورپی لوگ تھے۔

ہماری پہلی منزل بارسلونا تھی۔ بارسلونا میں کچھ دیر قیام کرنے کے بعد ہم کو آگے جانا تھا۔ بارسلونا کا ایر پورٹ یورپی انداز کا ایک خوبصورت ایر پورٹ تھا۔ وہ نہایت صاف ستھرا اور منظّم دکھائی دیا۔ یہاں کے لوگ انگریزی زبان کم اور اسپینی زبان زیادہ جانتے تھے۔ کسی مرحلہ پر بھی ایر پورٹ پر ہم سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی گئی۔ ایر پورٹ کی دیواروں میں لگے ہوئے بڑے بڑے شیشے کے باہر شہر بارسلونا کا ایک منظر دکھائی دے رہا تھا۔ اس قسم کے بڑے بڑے شیشے یوروپ کے ایر پورٹوں میں عام ہیں۔ مگر انڈیا کے ایر پورٹوں پر ایسا بہت کم نظر آتا ہے۔

بارسلونا میڈیٹیرینین سمندر کے ساحل پر واقع ہے۔ وہ ایک تجارتی سنٹر ہے اور اسپین کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ یہاں کی قدیم تاریخی عمارتیں سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہیں۔ بارسلونا ایک قدیم شہر ہے۔ وہ مختلف سلطنتوں کے تحت رہا ہے۔ تیسری صدی کے آخر میں اس کی پہلی شہری دیوار بنائی گئی۔ ۷۱۷ء میں بارسلونا مسلم سلطنت کے تحت آیا۔ ۸۰۱ میں شہنشاہ لوئی اول نے عربوں کو یہاں سے نکال دیا اور اس شہر کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔

Barcelona fell, around 717, under the sway of the Islamic world. In 801 the Carolingian emperor Louis I the Pious expelled the Arabs and added the city to his domains. (Vol. 2/720)

سید رشید رضا مشہور عرب عالم ہیں۔ وہ عربی کے علاوہ اور بھی کئی زبانیں جانتے تھے۔ وہ فرانسیسی زبان بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ سید رشید رضا نے تقریباً ۷۰ سال پہلے ایک سلسلۂ مضامین اپنے مجلّہ المنار میں شائع کیا تھا جو بعد کو کتاب کی صورت میں چھپا۔ اس کتاب کا نام یہ تھا: لماذا

تأخر المسلمون وتقدم غيرهم (مسلمان کیوں پیچھے ہوگئے اوران کے سوادوسرے کیوں آگے ہوگئے)۔

اس کتاب میں مصنف نے قدیم مسلمانوں کی شجاعت کے کئی واقعات پر جوش طور پر بیان کئے ہیں۔ ماضی کے ان واقعات کو بیان کر کے موجودہ مسلمانوں کو ابھارا ہے کہ وہ بھی اپنے اسلاف کی اس بہادرانہ تاریخ کو دہرائیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اسپین کے شہر بارسلونا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

''افسوس ہے کہ ہم وہ زمانہ بھول گئے ہیں جب کہ محض بیس مسلمان بارسلونا سے فرانس کے جنوب میں فراکسیمہ کو آئے اور پہاڑ پر قبضہ کر کے اور ایک قلعہ بنا کر رہنے لگے اور پھر آہستہ آہستہ اُن کی تعداد بڑھتی چلی گئی، یہاں تک کہ وہ ایک سو ہوگئے۔ تب انہوں نے ایک باقاعدہ حکومت قائم کی، اور فرانس کے جنوبی حصہ کے علاوہ اٹلی کے شمالی حصہ پر بھی قبضہ کرلیا۔ مسلمانوں کی تعداد صرف ایک سو تھی۔ مگر اس حال میں بھی گردونواح کے بادشاہ اُن کی دوستی کے طلب گار تھے۔ کوہِ الپ کی چوٹی اور فرانس اور اٹلی کے وسطی پہاڑوں کی شاہراہیں ان کے قبضہ میں تھیں اور اِن راستوں سے جس قدر بھی قافلے گزرتے تھے، وہ اُن سب سے ٹیکس وصول کرتے تھے۔ اس چھوٹی سی جماعت نے یہاں تک ترقی کی کہ وہ یورپ اور سوئزرلینڈ کے وسط میں بحیرۂ کونستانزہ تک پہنچ گئی اور پورے پچانوے سال تک ان علاقوں پر حکمراں رہی۔ آخر کار تمام اہل فرنگ متحدہ قوت سے ان کو مٹانے پر کمربستہ ہوگئے، یہاں تک کہ وہ مسلسل لڑائیوں کے بعد مٹا دئے گئے۔ اس وقت مسلمان عربوں کی تعداد ۱۵۰۰ سے زیادہ نہ تھی۔''

سید رشید رضا نے اپنے خیال کے مطابق، اس کو دردناک بزدلی قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

''مسلمانوں کے تنزل کا ایک بڑا سبب بزدلی ہے۔ ہمارے اسلاف تمام اقوام عالم میں

شجاعت وشہامت کے لیے مشہور تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب ایک مسلمان تن تنہا دس آدمیوں کا اور بعض دفعہ سو کا مقابلہ کرتا تھا۔ مگر آج یہ حالت ہے کہ وہ موت کے نام سے بھی ڈرتے ہیں۔ زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ہم اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام کے دشمن اپنی قوم اور وطن کے لیے کس کس طرح موت سے کھیل رہے ہیں۔ لیکن ہم پھر بھی شرم نہیں کرتے۔ پرانے زمانہ کی یہ روایات بدل گئی ہیں۔ اب ان کے چند آدمی مسلمانوں کی بڑی تعداد کا مقابلہ کر کے مسلمانوں کو شکست دے دیتے ہیں۔''

سید رشید رضا اور ان کے جیسے دوسرے رہنماؤں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ غلط تقابل کا شکار ہیں۔ وہ زوال یافتہ قوم کا تقابل عروج یافتہ قوم سے کر رہے ہیں۔ دور اول میں مسلمان عروج پر تھے اور یورپی قومیں زوال پر۔ بعد کو یہ ہوا کہ یورپی قوموں میں احیاء کا عمل ہوا اور وہ عروج پر پہنچ گئیں۔ جب کہ اس کے مقابلہ میں مسلمان قانونِ فطرت کے تحت اپنے زوال کے دور میں پہنچ چکے تھے۔

اس فرق کو نہ رشید رضا اور شکیب ارسلان نے سمجھا اور نہ اقبال اور شبلی نعمانی اس کو سمجھ سکے۔ اس بے خبری کی بنا پر ان لوگوں نے مسئلہ کا حل صرف یہ سمجھا کہ ہدی خوانی کر کے مسلمانوں کو ابھارا جائے۔ مگر یہ ہدی خوانی یا بانگ درا کا مسئلہ نہ تھا بلکہ یہ مسلمانوں کے احیاء نو کا مسئلہ تھا۔

قرآن کے الفاظ میں، یہ بنجر زمین کو دوبارہ محنت کر کے زرخیز بنانے کا مسئلہ تھا (الحدید ۱۶۔۱۷)۔ یہ تشخیص کی غلطی تھی۔ تشخیص کی اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سو سال سے بھی زیادہ لمبی جدوجہد بے نتیجہ ہو کر رہ گئی، وہ کسی مثبت نتیجہ تک نہیں پہنچی۔

بارسلونا سے اگلے جہاز کے ذریعہ استانبول کے لیے روانگی ہوئی۔ یہ نسبتاً مختصر سفر تھا۔ لمبے سفر میں عام طور پر ڈائرکٹ فلائٹ نہیں ہوتی۔ مسافر کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک ایرپورٹ سے دوسرے ایرپورٹ پہنچے اور جہاز کو بدل کر اپنا سفر جاری رکھے۔

جہاز کو بدلنے کا یہ معاملہ میرے ذوق کے سخت خلاف ہے۔ تاہم اس کا ایک فائدہ ہے۔ ایک ہی جہاز کے ذریعہ زیادہ لمبا سفر کرنے سے آدمی اکتا جاتا ہے، خواہ وہ فرسٹ کلاس میں سفر کر رہا ہو۔

کیوں کہ سفر بہر حال سفر ہے۔ جہاز بدلنے کی صورت میں مسافر کو ایک قسم کی راحت مل جاتی ہے۔ ایر پورٹ پر چڑھنے اترنے اور نقل وحرکت کی وجہ سے سفر کی اکتاہٹ بڑی حد تک کم ہو جاتی ہے۔

استانبول پہنچے تو دوبارہ وہی دیکھا ہوا منظر سامنے تھا۔ استانبول یورپ کا ایک شہر ہے مگر یورپ کے دوسرے ترقی یافتہ شہروں کے مقابلہ میں ابھی وہ بہت پیچھے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی ابھی تک یورپین یونین کا ممبر نہ بنایا جاسکا۔

مسلمان عام طور پر اس کو تعصب کا ایک معاملہ سمجھتے ہیں۔ مگر مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ ترکی کو یورپی یونین کے ساتھ ملانے کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی غریب شخص ایک امیر شخص سے کہے کہ آؤ ہم اور تم اپنے دسترخوان کو ملالیں اور مشترک طور پر ایک ساتھ کھائیں۔ یورپ کے ناقدین خود اپنے معاملہ میں کبھی ایسی غیر مساوی مشارکت کو قبول نہیں کریں گے پھر وہ کیوں کر امید کر رہے ہیں کہ ترقی یافتہ یورپ اس کو قبول کر لے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ ترکی کو یورپی یونین سے ملانے کے عمل کا آغاز ترکی کو ہر اعتبار سے مغربی معیار کے مطابق ترقی یافتہ بنانے سے ہوتا ہے نہ کہ ترکی کو اس کی موجودہ حالت پر باقی رکھتے ہوئے دونوں کو یکساں طور پر ایک درجہ دینے کا۔

استانبول سے دہلی کا سفر ایک لمبا سفر تھا۔ یہ سفر ایر انڈیا کے ذریعہ طے ہوا۔

۱۔ زی نیوز (نئی دہلی) کے اسٹوڈیو میں ۲۲ ستمبر ۲۰۰۴ کو ایک خصوصی پروگرام ہوا۔ چار سال پہلے ایسا ہوا کہ عارف نامی ایک فوجی نے کارگل کی لڑائی میں حصہ لیا۔ پھر وہ غائب ہوگیا۔ لڑائی پر جانے سے صرف چند مہینہ پہلے عارف کی شادی ایک مسلم خاتون سے ہوئی جس کا نام گڑیا تھا۔ تین سال سے زیادہ مدت گذرنے کے بعد عارف کو مفقود الخبر قرار دے دیا گیا اور گڑیا کا دوسرا نکاح توفیق نامی ایک شخص سے کر دیا گیا۔ مگر عارف زندہ تھا اور وہ پاکستان کی جیل میں تھا۔ چار سال بعد وہ چھوٹ کر آیا۔ اُس وقت تک گڑیا دوسرے شوہر کے ذریعہ حاملہ ہو چکی تھی۔ اب یہ سوال تھا کہ گڑیا کا معاملہ کس طرح طے کیا جائے۔ ۲۲ ستمبر کو گاؤں کے لوگ، نیز متعدد علماء زی ٹی وی کے اسٹوڈیو میں اکھٹا ہوئے اور یہاں ایک گھنٹہ سے زیادہ بحث کے بعد فقہی مسئلہ کے مطابق، اس کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں بطور ایک اکسپرٹ کے شرکت کی اور معاملہ کو حل کرنے میں مدد کی۔ خدا کے فضل سے معاملہ خوش اُسلوبی کے ساتھ طے ہوگیا۔

۲۔ ٹی وی نیٹ ورک آج تک (نئی دہلی) کی ٹیم نے ۳۰ ستمبر ۲۰۰۴ کی شام کو صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس کے انٹرویور مسٹر محمد انس زبیر اور کیمرہ مین دھیرج ہیلان تھے۔ انٹرویو کا موضوع شب برأت تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ قرآن کی سورہ نمبر ۴۴ (الدخان) میں ایک آیت ہے جس میں ایک بابرکت رات کا ذکر ہے۔ اس رات کو اہم خدائی فیصلے کئے جاتے ہیں۔ قرآن میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ یہ رات کس تاریخ کو ہوتی ہے۔ البتہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۵ شعبان کی رات ہے۔ اس رات کو تلاوت اور عبادت اور دعا کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ دنیا اور آخرت کی کامیابی کی دعائیں کی جاتی ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ عبادت کا ثواب یا دعا کی مقبولیت پراسرار طور پر نہیں ہوتی۔ اس کا تعلق اخلاص اور دل کی نیت سے ہے۔

۳۔ نروندنا کی ٹیم نے ۳۰ ستمبر ۲۰۰۴ کو دوردرشن کے لیے صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس انٹرویو کے سوالات زیادہ تر دو موضوع سے متعلق تھے۔ ایک یہ کہ اسلام میں قومی اتحاد کا تصور کیا ہے۔ جواب میں بتایا گیا کہ ایک خالق اور ایک انسان کا تصور قومی ایکتا اور انسانی اتحاد پیدا کرتا ہے۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ ہندستان کی ندیوں کا رول اس سلسلہ میں کیا ہے۔ اس کے جواب میں بتایا گیا کہ ندی یا پہاڑ یا سورج یا چاند کوئی چیز اسلام میں مقدس نہیں ہے۔ البتہ نیچر کو اسلام میں اخلاقی ماڈل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً دریا اور پیڑ انسان کو کسی معاوضہ کے بغیر بہت سے فائدے پہنچاتے ہیں۔ اسی طرح انسان کو فائدہ بخش بن کر دنیا میں رہنا چاہیے۔

۴۔ گاندھی درشن سمیتی (نئی دہلی) میں یکم اکتوبر ۲۰۰۴ کو ایک نیشنل سیمینار ہوا۔ یہ سیمینار مشہور کانگریسی لیڈر رزمل دیش پانڈے کی صدارت میں ہوا۔ اس میں کئی ممتاز شخصیتیں شریک ہوئیں۔ یہ سیمینار گاندھی اور گنگا کے موضوع پر ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اُنہوں نے کہا کہ گاندھی اور گنگا کو ملک کی

پہچان بتایا جاتا ہے۔ مگر آزادی کے بعد ملک میں گاندھی اور گنگا کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ حالاں کہ گاندھی اور گنگا کے نام پر اربوں روپئے خرچ کیے جا چکے۔ اصل یہ ہے کہ انڈیا میں سب سے بڑا مسئلہ کرپشن ہے۔ کرپشن کی وجہ سے یہاں کے ہر کام بگڑے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں انڈیا میں کسی بھی اصلاحی اور تعمیری کام کا آغاز کرپشن کے خاتمہ کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔ موجودہ کرپشن کی صورت میں کوئی تعمیری کام ہونے والا نہیں۔

۵۔ جین مہاسبھا کی طرف سے دہلی میں ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۴ کو ایک سرو دھرم سمبھاؤ سماروہ منعقد ہوا۔ اس میں مختلف مذاہب کے نمائندوں نے اظہار خیال کیا۔ اس کا افتتاح دہلی کی چیف منسٹر شیلا دکشت نے کیا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ ان کو تقریر کا جو موضوع دیا گیا تھا وہ یہ تھا:

Universal Friendship and Forgiveness

انہوں نے بتایا کہ ہر مذہب میں اور اسی طرح اسلام میں ان دونوں باتوں پر کافی زور دیا گیا ہے۔ ایک طرف اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ مذہبی یا کلچرل فرق کے باوجود تمام لوگوں کو انسان کے روپ میں دیکھا جائے۔ دوسری طرف سچے مومن کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ وہ لوگوں کو معاف کرنے والا ہوتا ہے (والعافین عن الناس) لوگوں کے اندر عفوو درگذر کا مزاج بہت ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو تمام انسانوں سے دوستانہ تعلق قائم نہیں ہوسکتا۔

۶۔ منسٹری آف ہوم افرس کے تحت قائم شدہ ادارہ نیشنل فاؤنڈیشن فار کمیونل ہارمنی کی طرف سے صدر اسلامی مرکز کے نام دعوت نامہ (۲۲ ستمبر ۲۰۰۴) موصول ہوا۔ اس میں دعوت دی گئی تھی کہ وہ ادارہ کی گورننگ باڈی کے ممبر کی حیثیت سے ۱۵ اکتوبر کو ہونے والی میٹنگ میں شرکت کریں۔ یہ میٹنگ ہوم منسٹر شیوراج پاٹل کی صدارت میں ہوئی۔ اس کا موضوع ملک میں کمیونل ہارمنی کے مسئلہ پر غور کرنا تھا۔ مگر صدر اسلامی مرکز بعض وجوہ سے اس میں شرکت نہ کرسکے۔ البتہ کمیونل ہارمنی اور پیس کے موضوع پر ان کی تازہ مطبوعہ کتاب امن عالم (صفحات ۲۰۸) بھیج دی گئی جو ہوم منسٹر مسٹر شیوراج پاٹل کو دستی طور پر پہنچائی گئی۔

۷۔ اسٹار نیوز (نئی دہلی) میں ۱۹ اکتوبر ۲۰۰۴ کی شام کو خبروں کی بلیٹن میں ''ماڈل نکاح نامہ'' کی خبر نشر ہوئی جو کچھ لوگوں کی طرف سے بنایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں پروگرام کے دوران اکسپرٹ کے طور پر صدر اسلامی مرکز کی رائے بلیٹن میں شامل کر کے نشر کی گئی۔ اس کی صورت یہ تھی کہ انہوں نے اپنے آفس سے ٹیلی فون پر اپنی رائے بتائی اور وہ بلیٹن کے ساتھ ان کے لائیو ٹیلی کاسٹ میں شامل کی گئی۔ انہوں نے کہا کہ ماڈل نکاح نامہ موجودہ حالات میں عملاً چلنے والا نہیں۔ اس سے پہلے اسی مسلم تنظیم نے شاہ بانو کے مسئلہ پر ماڈل ایکٹ بنوایا تھا مگر وہ عملاً رائج نہ ہوسکا۔ خود مسلمان اس کے خلاف عدالتوں سے فیصلے لیتے رہے۔ اس معاملہ میں اصل مسئلہ مسلمانوں کی سوچ کو بدلنا ہے نہ کہ کوئی دستاویز جاری کرنا۔

۸۔ آج تک ٹی وی (نئی دہلی) کی ٹیم نے ۱۱ اکتوبر ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس

کے انٹرویور مسٹر محمد انس زبیر تھے۔ اس کا موضوع ارکان خمسہ تھا۔ اس کے تحت بتایا گیا کہ یہ پانچ ارکان گویا اسلام کے چار بنیادی اقدار (basic values) ہیں۔ اول توحید، توحید کا مطلب ہے خدارخی زندگی اختیار کرنا۔ دوم نماز، نماز اس بات کی تربیت ہے کہ آدمی دنیا میں تواضع کے ساتھ رہے، وہ تکبر اور سرکشی سے بچے۔ سوم روزہ، روزہ کا مقصد سلف کنٹرول کی تربیت ہے۔ چہارم زکوٰۃ، زکوٰۃ کی حقیقت یہ ہے کہ اہل ایمان کے اندر انسانی ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ پنجم حج، حج عالمی اتحاد کا سبق ہے۔ حج کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اختلاف کے باوجود متحد ہوکر رہنا سیکھیں۔

۹۔ ہندی روزنامہ سہارا سمے (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر سنیل کمار نے ۱۱ اکتوبر ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس کا موضوع ''ہندستان میں فرقہ واریت کا مسئلہ'' تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ فرقہ وارانہ اختلاف ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ لوگوں کو اتنا زیادہ تعلیم یافتہ اور باشعور بنا دیا جائے کہ وہ بھڑکانے والوں کے شکار نہ بنیں۔ سماج میں ہمیشہ اختلاف بھی ہوتا ہے اور اختلاف کو بھڑکانے والے بھی۔ اس کا علاج سماج کو باشعور بنانا ہے نہ کہ اختلاف کو یا بھڑکانے والوں کو مٹانا۔

۱۰۔ ہفت روزہ نئی دنیا (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر جمشید عادل نے ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو نئی دنیا کے قرآن نمبر کے لیے تھا۔ اظہار خیال کے دوران بتایا گیا کہ قرآن ایک ابدی کتاب ہے اور وہ تمام انسانوں کے لیے ہے۔ قرآن اب بھی اسی اصل حالت میں محفوظ ہے جیسا کہ وہ پیغمبر اسلام کے زمانہ میں اُترا تھا۔

۱۱۔ ای ٹی وی (نئی دہلی) کی ٹیم نے ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ انٹرویور مسٹر محمد قاسم انصاری تھے۔ سوالات کا تعلق رمضان اور روزہ سے تھا۔ اس سلسلہ میں جو کچھ بتایا گیا اُس کا خلاصہ یہ تھا کہ روزہ دراصل صبر کی تربیت ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: **هو شهر الصبر**۔ زندگی میں صبر کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ صبر کے بغیر آدمی نہ دین پر قائم رہ سکتا اور نہ دنیا میں ترقی حاصل کرسکتا۔ اسی لیے سال کے ایک مہینہ کو صبر کی تربیت کے لیے شریعت میں خاص کیا گیا۔

۱۲۔ سائی انٹرنیشنل سینٹر (نئی دہلی) میں ۲۷ اکتوبر ۲۰۰۴ کو ایک سیمینار ہوا۔ اس میں مختلف مذاہب کے نمائندوں نے اپنے اپنے مذہب پر اظہار خیال کیا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور ہیومن ویلوز اِن اسلام کے موضوع پر تقریر کی۔ یہ پروگرام ایک گھنٹہ کا تھا۔ اس موقع پر اسلامی مرکز کی انگریزی کتابیں بھی لوگوں میں تقسیم کی گئیں۔

۱۳۔ نئی دہلی کے انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (انیکسی) میں ۲ نومبر ۲۰۰۴ کو دوروزہ سیمینار ہوا۔ اس میں ملک اور بیرون ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوئے۔ اس کا انتظام جس ادارہ کی طرف سے کیا گیا تھا اس کا نام یہ ہے:

Foundation for Universal Responsibility of the Dalai Lama.

اس سیمینار کا موضوع Understanding Death تھا۔ مختلف مذاہب کے نمائندوں نے اپنے اپنے مذہب کی تعلیمات کی روشنی میں موضوع پر اظہار خیال کیا۔ صدر اسلامی مرکز کو بھی دعوت دی گئی کہ ۲ نومبر کے اجلاس میں خطاب کریں۔ ان کو حسب ذیل موضوع دیا گیا تھا:

Islam and the Day of Judgement.

انہوں نے قرآن وحدیث کی تعلیمات کی روشنی میں اس موضوع پر تقریر کی۔ اس سیمینار کی پوری کارروائی انگریزی زبان میں ہوئی۔ کچھ انگریزی کتابیں بھی لوگوں کے درمیان تقسیم کی گئیں۔

۱۴۔ سری گرو گوبند سنگھ کالج آف کامرس (نئی دہلی) میں ۴۔۵ نومبر ۲۰۰۴ کو ایک سیمینار ہوا۔ یہ سیمینار سکھوں کی مقدس کتاب گرو گرنتھ صاحب کی تالیف (compilation) پر چار سو سال پورا ہونے پر کیا گیا۔ اس میں بہت سے اسکالر اور ممتاز افراد شریک ہوئے۔ مثلاً سابق پرائم منسٹر اندر کمار گجرال، گاندھیائی لیڈر نرمل دیش پانڈے، ساؤتھ افریقہ کے سابق سفیر ڈاکٹر جسپال سنگھ، جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے سینیر پروفیسر اختر الواسع صاحب، وغیرہ۔ اس سیمینار کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ انہوں نے ۴ نومبر کے افتتاحی اجلاس میں مقرر موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس تقریر میں اقبال کے دو شعر کو بنیاد بنایا گیا۔ اقبال نے گرونانک کے بارے میں کہا تھا:

نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا　　میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

اس موقع پر اسلامک سنٹر کی انگریزی کتابیں بڑی تعداد میں لوگوں کے درمیان تقسیم کی گئیں۔ خاص طور پر چھوٹی کتابوں کو لوگوں نے بہت پسند کیا۔

۱۵۔ ٹیلی فون کے ذریعہ دور کے مقامات پر دہلی سے دعوتی خطاب کا سلسلہ جاری ہے۔ ۵ نومبر ۲۰۰۴ کو سویڈن (اسٹاک ہوم) کے ایک اجتماع کو ٹیلی فون کے ذریعہ خطاب کیا گیا۔ اس کا موضوع تھا: قرآن کا پیغام۔ یہ سویڈن کے لیے پانچواں ٹیلی فونی خطاب تھا۔ اسی طرح ۷ نومبر ۲۰۰۴ کو ٹیلی فون پر دہلی سے فلوریڈا (امریکا) کی ایک مجلس کو خطاب کیا گیا۔ اس کا موضوع اسلامی عبادت تھا۔ یہ امریکا کے لیے اس قسم کا دسواں ٹیلی فونی خطاب تھا۔

۱۶۔ حسب ذیل نئی کتابیں چھپ کر آ گئی ہیں — سیرت رسول، عورت معمارِ انسانیت، امن عالم۔ ان کے علاوہ کچھ اور کتابیں تیار ہوئی ہیں جو انشاء اللہ جلد ہی چھپیں گی۔ ان کتابوں کے نام یہ ہیں: حکمتِ اسلام، کامیابی کا راز، وغیرہ۔

۱۷۔

I am Azra. I live in Sharjah, UAE. Your articles are wonderful. Most of the books seem to be boring after reading for some time, but the books written by you are never boring and in fact I feel that your

book should never finish. I don't understand why some people criticise you, though your work is excellent and based on truth. I am lucky that I managed to find Al-Risala of 1980, 1986 and so on, and I am astonished to find that what you wrote at that time is proved true even in today's state of the world. (Oct. 3, 2004)

۱۸۔

Thanks be to Allah Subhanahu wa Ta'ala for the guidance through you. I have successfully set up the Al Falah Study Centre which consists of a class room, library and a book store of Goodword Publications. I have also taken agency of Urdu Al-Risala. A brochure explaining the nature of work at the study centre is enclosed, the books are priced at a very low profit margin.

Maulana Saheb, Allah knows best, my intention is to spread the Goodword and I beseech Allah (SWT) for His special favour and blessing in the form of my two sons (now 11 and 9 years old) doing dawah work when they grow up Inshaallah.

I conduct classes thrice a week. On Tuesdays I teach in Urdu, on Thursdays in English, 15 to 20 ladies attend the classes and I teach children on Saturdays. Right now I am teaching from your book *Qalallah wa Qalar Rasool* and for the month of Ramazan we have discussed the articles from Saum-e-Ramazan.

The safarnama in Al-Risala are very very enlightening. I read each one several times. I am doing Islahi work regularly and Dawah work as and when the opportunity arises within the known circle of non-Muslims.

Maulana, I try my best to balance between my home and the work at the study centre and have become more time conscious. I keep asking Allah in my own words to help me manage all my work efficiently. I would like to know if there is a specific dua for this purpose.

My father is conveying his most respectful regards. We all pray daily for your well-being and a long life. I feel especially blessed to be a small part of your method of spreading the word of Allah. Goodword publications are the best books in every way from the message to the style and quality. (Fatima Sara, Banglore)